

# حویلی

## مشتاق احمد یوسفی

وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں یادش بخیر میں نے ۱۹۴۵ میں جب قبلہ کو پہلے دیکھا تو ان کا حلیہ ایسا ہو گیا تھا جیسا اب میرا ہے، لیکن ذکر ہمارے یار طرح دار بشارت علی فارقی کے خسر کا ہے، لہذا تعارف کچھ انہی کی زباں سے اچھا معلوم ہوگا، ہم نی بارہا سنا آپ بھی سنیے۔ وہ ہمیشہ سے میرے کچھ نہ کچھ لگتے تھے، جس زمانے میں میرے خسر نہیں بنے تھے تو پھوپا ہوا کرتے تھے اور پھوپا بننے سے پہلے میں انہیں چچا حضور کہا کرتا تھا، اس سے پہلے بھی یقیناً وہ کچھ اور لگتے ہوں گے، مگر اس وقت میں نے بولنا شروع نہیں کیا تھا، ہمارے ہاں مراد آباد اور کانپو میں رشتے ناتے ابلی ہوئی سویوں کی طرح الجھے اور پیچ در پیچ گہتے ہوتے تھے، ایسا جلالی، ایسا مغلوب الغضب آدمی زندگی میں نہیں دیکھا، بارے ان کا انتقال ہوا تو میری عمر آدھی ادھر، آدھی ادھر، چالیس کے لگ بھگ تو ہوگی، لیکن صاحب جیسی دہشت ان کی آنکھیں دیکھ کر چھٹ پن میں ہوئی تھی، ویسے ہی نہ صرف ان کے آخری دم تک رہی، بلکہ میرے آخری دم تک بھی رہے گی، بڑی بڑی آنکھیں اپنے ساکٹ سے نکلی پڑی تھیں، لال سرخ، ایسی ویسی؟ بالکل خون کبوتر لگتا تھا بڑی بڑی پتلیوں کے گرد لال ڈوروں سے ابھی خون کے فورے چھوٹنے لگیں گے اور میرا منہ خونم خون ہو جائے گا، ہر وقت غصے میں بہرے رہتے تھے، جنے کیوں گالی ان کا تکیہ کلام تھی، او رجو رنگ تقریر کا تھا وہی تحریر کا، رکہ ہاتھ نکلتا ہے دھواں مغز قلم سے، ظاہر ہے کچھ ایسے لوگوں سے بھی پالا پڑتا تھا، جنہیں بوجوہ گالی نہیں دے سکتے، ایسے موقوں پر زبان سے تو کچھ نہ کہتے لیکن چہرے پر ایسا ایکسپریشن لاتے کہ قد آدم گالی نظر آتے، کس کی شامت آئی تھی کہ نا کی کسی بھی رائے سے اختلاف کرتا، اختلاف تو درکنا، اگر کوئی شخص محض ڈر کے مارے ان کی

رائے سے اتفاق کر لیتا تو فوراً اپنی رائے تبدیل کر کے الٹے اس کے سر ہو جاتے۔

ارے صاحب بات اور گفتگو تو بعد کی بات ہے، بعض اوقات محض سلام سے مستعل ہو جاتے تھے، آپ کچھ بھی کہیں، کیسی ہی سچی اور سامنے کی بات کہیں وہ اس کی تردید ضرور کریں گے، کسی کی رائے سے اتفاق کرنے میں اپنی سبکی سمجھتے تھے، ان کا ہر جملہ نہیں سے شروع ہوتا تھا، ایک دن کانپور میں کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی، میرے منہ سے نکل گیا کہ آج بڑی سردی ہے بولے نہیں، کل اس سے زیادہ پڑے گی۔

وہ چچا سے پھوپا بنے اور پھوپا سے خسر الخدر لیکن مجھے آخر وقت تک نگاہ اٹھا کر بات کرنے کی جسارت نہ ہوئی، نکاح کے وقت وہ قاضی کے پہلو میں بیٹھے تھے، قاضی نے مجھ سے پوچھا قبول ہے، ان کے سامنے منہ سے ہاں کہنے کی جرأت نہ ہوئی، بس اپنی تھوڑی دسے دو مودبانہ ٹھونگیں مار دیں جنہیں قاضی قبلہ نے رشتہ مناکحت کیلئے ناکافی سمجھا قبلہ کڑک کر پولے لونڈے بولتا کیوں نہیں؟ ڈانٹ سے میں نروس ہو گیا، ابھی قاضی کا سوال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ میں نے جی ہاں قبول ہے کہہ دیا، آواز ایک لخت اتنے زور سے نکلی کہ میں خود چونک پڑا قاضی اچھل کر سہرے میں گھس گیا حاضرین کہلکہلانے ہنسنے لگے اب قبلہ اس پر بہنا رہے ہیں کہ اتنے زور کی ہاں سے بیٹھی والوں کی ہیٹی ہوتی ہے، بس تمام عمران کا یہی حال رہا، اور تمام عمر میں کرب قرابت داری قہری دونوں میں مبتلا رہا۔ حالانکہ اکلوتی بیٹی، بلکہ اکلوتی اولاد تھی اور بیوی کو شادی کے بڑے ارمان تھے، لیکن قبلہ نے مائیں کے دن عین اس وقت جب میرا رنگ نکہارنے کیلئے ابٹن ملا جا رہا تھا، کہلا بھیجا کہ دولہا میری موجودگی میں اپنا منہ سہرے سے باہر نہیں نکالے گا، دو سو قدم پہلے سواری سے اتر جائے گا اور پیدل چل کر عقد گاہ تک آئے گا، عقد گاہ انہوں نے اس طرح کہا جیسے اپنے فیض صاحب قتل گاہ کا ذکر کرتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ قبلہ کی دہشت دل میں ایسی بیٹھ گئی تھی کہ مجھے تو عروسی چہر کہٹبھی پہانسی گھاٹ لگ رہا تھا انہوں نے یہ شرط بھی لگائی کہ براتیلاؤ زردھ ٹھونسے کے بعد ہر گز یہ نہیں کہیں گے کہ گوشت کم ڈالا اور شکر ڈیورٹھی نہیں پڑی، خوب سمجھ لو، میری حویلی کے سامنے بینڈ باجا ہر گز نہیں بجے گا اور تھمیں رنڈی نچوانی ہے تو میرے لاش پر، اپنے کوٹھے پر ے نچوائو

کسی زمانے میں راجپوتوں اور عربوں میں لڑکی کی پیدائش نحوست اور قہر الہی کی نشانی تصور کی جاتی تھی، ان کی غیرت یہ کیسے گوارا کر سکتی تھی کن ان کے گھر برات چڑھے، داماد کے خوف سے وہ نوزائیدہ لڑکی کو زندہ گاڑ آتے تھے، قبلہ اس وحشیانہ رسم کے خلاف تھے، وہ داماد کو زندہ گاڑ دینے کے حق میں تھے۔

چہرے، چال اور تیور کو تو ال شہر لگتے تھے، کون کہہ سکتا تھا کہ بانس منڈی

میں ان کی عمارتی لکڑی کی ایک معمولی سی دکان ہے، نکلتا ہوا قد، چلتے تو قد سینہ اور آنکھیں، تینوں بیک وقت نکال کر چلتے ارے صاحب کیا پوچھتے ہیں، اول تو ان کے چہرے کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، اور کبھی جی کڑا کر کے دیکھ بھی لیا تو بس لال بہو کا آنکھیں نظر آتی تھیں، نگہ نرم گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد، رنگ گندمی آپ جیسا، جسے آپ اس گندم جیسا بتاتے ہیج جسے کہاتے ہی حضرت آدم، بیک بیوی ودو گوش جنت سے نکال دیے گئے، جب دیکھو جہلاتے تنتناتے رھتے ہیں، مزاج، زبان اور ہاتھکسی پر قابو نہ تھا، دائمی طیش سی لرزہ براندام رھنے کے سبب اینٹ، پتھر، لاٹھی، گولی، گالی، کسی کا بھی نشانہ ٹھیک نہیں لگتا تھا، گچھی گچھی مونچھیں جنہیں گالی دینے سے پہلے اور بعد میں تائو دیتے، آخری زمانے میں بہوؤں کو بھی بل دینے لگے، گھٹا ہوا کسرتی بدن ململ کے کرتے سے جھلکتا تھا، چنی ہوئی آستین اور اس سے بھی مہین چنی ہوئی دوپلی ٹوپی، گرمیوں میں خس کا عطر لگاتے، کیکری کی سلائی کا چوڑی دار پاجامہ، چوڑیوں کی یہ کثرت کہ پاجامہ نظر نہیں آتا تھا، دہوی دروازہ کھٹکھٹا کر بلائیں تو چوڑی دار ہی میں برآمد ہوں گے۔

واللہ میں تو یہ تصور کرنے کی بھی جرات نہیں کرسکتا کہ دائی نے انہیں چوڑی دار کے بغیر دیکھا ہوگا بھری بھری پنڈلیوں پر خوب کھبتا تھا، ہاتھ کے بنے ریشمی ازار بند میں چابیوں کا گچھا چہنچہناتا رھتا جو تالے برسوں پہلے بے کار ہو گئے تھے ان کی چابیوں بھیاس گچھے میں محفوظ تھیں، حد یہ کہاس تالے کی بھی چابی تھی جو پانچ سال پہلے چوری ہو گیا تھا، محلے میں اس چوری ک ابرسون چرچا رھا، اس لئے کہ چور صرف تالا، پھرہ دینے والا کتا اور ان کا شجرہ نصب چرا کر لے گیا تھا، فرماتے تھے کہ اتنی ذلیل چوری صرف کوئی عزیز رشتے دار ہی کرسکتا ہے، آخری زمانے میں یہ ازار بند گچھا بہت وزنی ہو گیا تھا اور موقع بے موقع فلمی گیت کے بازو بند کی طرح کھل کھل جاتا، کبھیجھک کر گرم جوشی سے مصافحہ کرتے تو دوسرے ہاتھ سے ازار بند تھامئے، مئی جون میں ٹمپریچر ۱۱۰ ہو جاتا اور منہ پر لو کے تھپڑ سے پڑ بے لگتے تو پاجامے سی ائیر کنڈیننگ کر لیتے، مطلب یہ کہ چوڑیاں کو گھنٹوں گھنٹوں پانی میں بگھو کر سر پر انگو چھا ڈالے، تربوز کہاتے، خس خانہ و برفاب کہاں سے لاتے، اس کے محتاج نہ تھے، کتنی ہی گرمی پڑے، دکان بند نہیں کرتے تھے، میان یہ تو بزنس، پیٹ کا دہندا ہے، جب چمٹے کی جھونپڑی پیٹ میں آگ لگ رہی ہو تو کیا گرمی کیا سردی لیکن ایسے میں کوئی شامت کا مارا گاہک آنکلے تو برا بہلا کہہ کے بہگا دیتے تھے، اس کے وجود وہ کھنچا کھنچا دوبارہ انہی کے پاس آتا تھا، اس لئے کہ جیسی عمدہ لکڑی وہ بیجتے تھے، ویسی سارے کانپور میں کہیں نہیں ملتی تھی، فرماتے تھے، داغی لکڑی بندے نے آج تک نہیں بیچی، لکڑی اور داغ دار؟ داغ تو دو ہی چیزوں پ رسجتا ہے دل اور جوانی۔

لفظ کے لچہن اور بازاری پان  
 تمباکو ، قوام، خربوزے اور کڑے ہوئے کرتے لکھنو سے حقہ مراد آباد اور  
 تالے علی گڑھ سے منگواتے تھے، حلوہ سوہن اور ڈپٹی نذیر احمد والے  
 محاورے دلی سے، دانت گرنے کے بعد صرف محاوروں پر گزارا تھا، گالیاں  
 البتہ مقامی بلکہ خانہ ساز دیتے جن میں سلامت وردانی پائی جاتی تھی، طبع زاد  
 لیکن بلاغت سے خالی، بس جغرافیہ سا کہینچ دیتے تھے، سلیم شاہی جوتیاں اور  
 چڑی آپ کے جے پور سے منگواتے تھے، صاحب آپ کا راجہستان بھی خوب  
 تھا، کیا کیا سو غائیں گنوائیں تھیں اس دن آپ نے۔۔۔۔؟ کہانڈ، سانڈ، بہانڈ اور رانڈ،  
 اور یہ بھی خوب رہی کہ مار واڑیوں کو جس چیز پر بھی پیار آتا ہے اس کے  
 نام میں ٹہ، ڈ، اور ژ لگا دیتے ہیں، مگر یہ بات آپ نے عجیب بتائی کہ  
 راجہستان میں رانڈ سے مراد خوب صورت عورت ہوتی ہے مارواڑی زبان  
 میں سچ مچ کی بیوہ کے لئے بھی کوئی لفظ ہے کہ نہیں؟ یا سبھی خوب صورت  
 نور علی نور بلکہ حور علی ہوتی ہیں، لیکن یہ بھی درست ہے کہ سوسوا سو  
 سال قبل تک رنڈی سے بھی مراد صرف عورت ہی ہوتی تھی، جب سے مردوں  
 کی نیتیں خراب ہوئیں، اس لفظ کے لچہن بھی بگڑ گئے، صاحب راجہستان کے  
 تین طرفہ تحفوں کے تو ہم بھی قائل اور گہائل ہیں، میرا بائی، مہندی حسن اور  
 ریشمان۔

ہاں تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ باہر نکلتے تو ہاتھ میں پان کی ڈبیا اور بٹوہ رہتا،  
 بازار کا پان ہر گز نہیں کہاتے تھے، کہتے تھے بازاری پان صرف رنڈوے  
 ،تماش بین اور بمبئی والے کہاتے ہیں، صاحب ین نفاست اور پریز میں نے  
 انہی سے سیکھا، ڈبیا چانڈی کی، نقشین، بہاری، ٹہوس، اسمیں جگہ جگہ ڈینٹ  
 نظر آتے تھے جو انسانی سروں سے تصادم کے باعث پڑے تھے طیش میں اکثر  
 پانوں بھری ڈبہ پھینک مارتے، بڑی دیر تک تو یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ  
 مضروب کے سر اور چہرے سے خون نکل رہا ہے بکھرے پانوں کی لالی  
 نے غلط جگہ رنگ جمایا ہے، بٹوے خاص طور سے آپ کی جائے پیدائش  
 دریاست ٹونک سے منگواتے تھے، کہتے تھے کہ وہاں کے پٹورے ایسے  
 ڈورے ڈالتے ہیں کہ اک ذرا گھنڈی کو جھوٹوں ہاتھ لگا دو تو بٹوہ آپی آپ  
 مصاحبوں کی باچہوں کی طرح کہلتا چلا جاتا ہے، گٹکا بہوپال سے آتا تھا لیکن  
 خود ہی نہیں کہاتے تھے، فرماتے تھے میٹھا پان، ٹہمری، گٹکا اور ناول، یہ  
 سب نابالغوں کے شغل ہیں، شاعری سے کوئی جاچ دلچسپی نہ تھی، ردیف  
 قافیے سے آزاد شاعری بے بطور خاص چڑتے تھے، یوں بھی، بقول شخصے  
 ، آزاد شاعری کی مثال ایسی ہے جیسے بغیر نیٹ کے ٹینس کھیلنا، لیکن اتنا  
 ضروری تھا کہ اردو فارسی کے جتنے بھی اشعار لکڑی، آگ، دہویں، ہیکڑی،  
 لڑمرنے، ناکامی اور خوداری سے متعلق ہیں سب یاد کر رکھے تھے، صورت  
 حال کسی بھی قابو سے باہر ہو جاتی تو شعر سے اس کا دفعیہ فرماتے، آخری  
 زمانے میں عزت گزریں اور مدم بیزار ہو گئے اور صرف دشمنوں کے جنازے

کو کندھا دینے کے لئے باہر نلکتے تھے ، جودک وکاسنی اور بیوی کو موتیا رنگ پسند تھا، شیروانی ہمیشہ موتیا رنگ کے ٹسر کی پہنی۔  
واہ کیا بات کورے برتن کی

بشارت کی زبانی تعارف ختم ہوا، اب کچھ میری کچھ ان کی زبانی سنئے اور  
رہی سہی زبان خلق سے جسے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ کانپور میں پہلے بانس  
منڈی اور پھر کو پر گنج میں قبلہ کی عمارتی لکڑی کی دکان تھی، اسی کو اپ  
ان کا حلیہ معاش اور وسیلہ مردم آزاری کہہ سکتے ہیں، تھوڑی بہت جلانے  
کی لکڑی بھی رکھتے تھے مگر اسے کبھی بھی لکڑی نہیں کہا، سوختہ یا ہیزم  
سوختہ کہتے تھے، ان کی دکان کو کبھی کوئی نا آشنا نے مزاج ٹال کہہ دیتا ہے  
تو دوسیری لے کر دوڑتے تھے، جوانی میں پیسنیری لے کر دوڑتے تھے، تمام  
عمر پتھر کے باٹ استعمال کئے فرماتے تھے، لوہے کے فرنگی باٹ بھاری  
اور بے برکت ہوتے ہیں، پتھر باٹ کوبازوں میں بھر کے سینے سے لگا کر  
اٹھانا پڑتا ہے اعمال تو دور رہے، کسی کو یہ جرات نہیں ہوئی کہ ان پتھروں  
کا وزن ہی کروالے، کس کی شامت آئی تھی کہ ان دی ہوئی رقم یا لوٹائی ہوئی  
ریزگاری گن لے، اس زمانے میں، یعنی اس صدی کی تیسری دہائی میں  
عمارتی لکڑی کی کھپت بہت کم تھی، سال اور چیڑ کا رواج عام تھا، بہت ہوا تو  
چوکھٹ اور دروازے شیشیم کے بنوائے، ساگوں ان تو صرف امرارؤسا کی  
ڈائننگ ٹیبل اور گوروں کے تابوت میں استعمال ہوتی تھی، فرنیچر ہوتا ہی  
کہاں تھا، بھلے گھروں میں فرنیچر کے ذیل میں صرف چار پائی آتی تھی، جہاں  
تک ہمیں یاد پڑتا ہے، ان دنوں کرسی صرف دو موقعوں پر نکالی جاتے تھے،  
اول، جب حکیم، وید، ہومیوپیتھ، پیر، فقیر اور سیانوں سے مایوس ہو کر  
ڈاکٹر کو گھر بلایا جائے، اس پر بیٹھ کے وہ جگہ جگہ اسٹے تھس کوپ لگا کر  
دیکھتا کہ مریض اور موت کے درمیان جو خلیج حائل ہوتی تھی اسے ان  
حضرات نے اپنی دواؤں اور تعویذ گنڈوں سے کس حد تک پر کیا ہے، اس  
زمانے کا دستور تھا کہ جس گھر میں موسمی یا مہیمن لکڑی کی پٹاری میں  
روئی میں رکھے ہوئے پانچ انگور ائیں یا سولا ہیٹ پہنے ڈاکٹر آئے اور اس  
کے آگے آگے ہٹو بچو کرتا ہوا تیمار دار خصوصی اس کا چمڑے کا بیگ  
اٹھائے تو اڑوس پڑوس والے جلدی جلدی کھانا کھا کر خود کو تعزیت اور کاندھا  
دینے کے لئے تیار کر لیتے تھے، درحقیقت ڈاکٹر اس مرحلے پر بلا کر اس  
کرسی پر بیٹھا دیا جاتا تھا، جب وہ صورت ہال پیدا ہوا جائے جس میں دو ہزار  
سال پہلے لوگ حضرت عیسیٰ کو آزماتے تھے، کرسی کے استعمال کا دوسرا  
اور آخری موقع ہمارے یہاں ختنوں پر آتا تھا جب لڑکے کو دولہا کی طرح سجا  
بنا کر اور مٹی کا کھولنا ہاتھ میں دے کر اس کرسی پر بیٹھا دیا جاتا تھا، اس  
جلادی کرسی کو دیکھ اچھے اچھوں کی گہگہی بند ہو جاتی تھی، غریبوں میں  
اس مقصد کے لیے نئے مات یا لمبی وضع کے کورے مٹکے کو الٹا کر کے سرخ  
کپڑا ڈال دیتے تھے۔

## چارپائی

سچ تو یہ ہے کہ جہاں چار پائی ہو وہاں کسی فرنیچر کی ضرورت نہ گنجائش، نہ تک، انگلستان کا موسم اگر دل اتنا ذلیل نہ ہوتا اور انگریزوں نے بروقت چار پائی نہ ایجاد کر لی ہوتی تو نہ صرف یہ کہ وہ موجودہ فرنیچر کی کھکھڑیاں سے بچ جاتے، بلکہ پھر آرام دہ چار پائی چھوڑ کر، کالونیز بنانے کی خاطر، گھر سے باہر نکلنے کو بھی ان کا دل نہ چاہتا، اوور ورکڈ سورج ان کی سلطنت پر ایک دچدی تک ہمہ وقت چمکتے رہنے کی ڈیوٹی سے بچ جاتا، اور کم از کم آج کل کے حالات میں اٹواٹی کھٹواٹی لے کر پڑا رہنے کے لئے ان کے گھر میں کوئی ڈہنگ کی چیز تو ہوتی، ہم نے ایک دن پروفیسر قاضی عبدالقادر وس ایم اے، بیٹی سے کہا کہ بقول آپ کے، انگریز تمام ایجادات کے موجد ہیں، آسائش پسند، بے حد پریکٹکل لوگ ہیں، حیرت ہے چار پائی استعمال نہیں بولے ادون کسنے سے جان چراتے ہیں، راقم الحروف کے خیال میں ایک بنیادی فرق ذہن میں ضرور رکھنا چاہئے، وہ یہ کہ یورپین فرنیچر صرف بیٹھنے کے لیے ہوتا، جب کہ ہم کسی ایسی چیز پر بیٹھتے ہی نہیں جس پر لیٹ نہ سکیں، مثال میں دری، گدیلے، قالین، جازم، چاندنی، چارپائی، کوچہ یار اور پہلوئے دلدار کو پیش کیا جاسکتا ہے ایک چیز ہمارے ہاں البتہ ایسی تھی، جسے صرف بیٹھنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا، اسے حکمرانوں کا تخت کہتے ہیں، لیکن جب انہیں اس پر لٹکا کر اور پھر لٹا کر نہلا دیا جاتا ہے تو یہ تختہ کھلاتا تھا اور اس عمل کو تختہ الٹنا کہتے ہیں۔

اسٹیشن، لکڑی منڈی او ر بازار حسن میں بجوگ

مقصد اس تمہید غیر دل پزیر کا یہ کہ جہاں چارپائی کا چلن ہو وہاں فرنیچر کی بزنس پنپ نہیں سکتی، اب اسے چوب عمارتی کہئے یا ہیزم غیر سوختنی دہند اس کا بھی ہمیشہ مندا ہی رہتا تھا کہ دکانوں کی تعداد گا ہکوں سے زیادہ تھی، لہذا کوئی شخص ایسا نظر آجائے جو حلیے اور چال ڈہال سے زرا بھی گا ہک معلوم ہوتو لکڑ منڈی کے دکان دار اس پر ٹوٹ پڑتے بیشتر گاہک گرد نواح کے دہباتی ہوتے جو زندگی میں پہلی اور آخری بار لکڑی کانپور آتے تھے، ان پجاروں کا لکڑی سے دو ہی مرتبہ سابقہ پڑتا تھا، ایک اپنا گھر بناتے وقت، دوسرے اپنا کریا کرم کرواتے سمے، قیام پاکستان سے پہلے جن پڑنے والوں نے دلی یا لاہور کے ریلوے اسٹیشن کا نقشہ دیکھا ہے، وہ اس چھینا جھپٹی کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ ۱۹۴۵ میں ہم نے دیکھا کہ دلی سے لاہور آنے والی ٹرین کے رکتے ہی جیسے مسافر نے اپنے جسم کا کوئی حصہ دروازے یا کھڑکی سے باہر نکالا، قلی نے اسی کو مضبوطی سے پکڑ کے سالم مسافر کو ہتھیلی پر رکھا اور ہوا میں ادھر اٹھالیا اور اٹھا کر پلیٹ فارم پر کسی صراحی یا حقے پر بٹھا دیا، لیکن جو مسافر دوسرے مسافروں کے دہکے سے خود بخود ڈبے سے باہر نکل پڑے، ان کا حشر ویسا ہی ہوا جیسا اردو کی کسی نئی نویلی کتاب کا نقادوں کے ہاتھ ہوتا ہے، جو چیز جتنی بھی جس کے

ہاتہ لگی ، سر پر رکھ کر ہوا ہو گیا، دوسرے مرحلے میں مسافر پر ہوٹلوں کے دلال اور ایجنٹ ٹوٹ پڑتے ، سفید ڈرل کا کوٹ پتلون ، سفید قمیض ، سفید رومال، سفید کینوس کے جوتے ، سفید موزے ، سفید دانت، اس کے باوجود ہم محمد حسین آزاد کے الفاظ میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ چنبیلی کا ڈبیر پڑا ہنس رہا ہے، ان کی ہر چیز سفید اور اجلی ہوتی ہے، سوائے چہرے کے، ہنستے تو معلوم ہوتا تو ہنس رہا ہے، یہ مسافر پر اس طرح گرتے ہیں جیسے انگلستان میں رگبی کی گیند اور ایک دوسرے کھلاڑی گرتے ہیں، ان کی ساری تنگ و دو کا مقصد خود کچھ حاصل کرنا نہیں بلکہ دوسروں کو حاصل کرنے سے باز رکھنا ہوتا ہے، مسلمان کو ٹونٹی دار لوٹے، مستورات، کثرت اطفال اور قیمے کے بہیکے سے فوراً پہچان لیتے اور فوراً اسلام علیکم بانی کہ کر لپٹ جاتے ، مسلمان مسافروں کے ساتھ صرف مسلمان دلال ہی دہینگا مشتی کر سکتے تھے، جس کا دلال ہاتہ مسافر کے کپڑوں کے مطبوط ترین حصے پر پڑتا وہی اس گھسٹیتا ہو باہر لے آتا، جن کا ہاتہ لباس کے کمزور یا بوسیدہ حصوں پر پڑتا وہ بعد میں ان کو بطور دستی رومال استعمال کرتے، نیم ملبوس مسافر قدم قدم پر اپنی سترکشائی کرواتا، اسٹیشن کے باہر قدم رکھتا تو لاتعداد پہلوان جنہوں نے اکھاڑے کو ناکافی محسوس کرتے ہوئے تانگہ چلانے کا پیشہ اختیار کیا تھا، خود کو اس پر چھوڑ دیتے تھے، اگر مسافر کے تن پر کوئی چتیہڑا اتفاقاً بچہ رہا تو اسے بھی رام چندر جی کی کھڑاوں کی طرح سہادیتے، اگر کسی کے چوڑی دار کمر بند کا سرا تانگے والے کے ہاتہ لگ جاتا تو وہ غریب گرہ پر ہاتہ رکھے اس میں بندھا چلا آتا، کوئی مسافر کا دامن آگے سے کھینچتا، کوئی پھچھے سے زلیخائی کرتا ، آخری راوند میں س ایک تگڑا سا تانگے والا سواری کادایاں ہاتہ اور دوسرا منٹنڈ اور اس کا بایاں ہاتہ پکڑ کے کھیلنے لگتے ہیں، لیکن قبل اس کے ہر دو فریقین اپنے اپنے حصے کی ران نیچے بیٹھ کر مسافر کو یخلت اپنے کندہوں پر اٹھا لیتے اور تانگے میں جوت کر ہوا ہو جاتا۔

کم و بیش یہی نقشہ کو پر گنج کی لکڑی منڈی ہوا کرتا تھا، جس کے قلب میں قبلہ کی دکان تھی، گودام بالعموم دکان سے ملحق، عقب میں ہوتے تھے، گاہک پکڑنے کے لیے قبلہ اور تین چڑی مار دکان داروں نے یہ کیا کہ دکانوں کے باہر سڑک پر لکڑی کے چھوٹے چھوٹے کین بنالیے، قبلہ کا کین مسمند تکیئے ، حقے، اگال دان اور اسپرنگ سے کھلنے والے چاقوں سے آراستہ تھا، کین گویا ایک نوع کا مچان تھا، جہاں سے گاہک کو مار گراتے تھے، پھر اسے چمکار پچکار کر اندر لے جایا جاتا جہاں کوشش یہ ہوئی تھی، کہ خالی ہاتہ اور بھری جیب واپس نہ جانے پائے، جیسے ہی کوئی شخص جو قیافے سے گاہک سے لگتا، سامنے سے گزرتا تو دور و نزدیک کے دکان دار اسے اشارے سے یا آواز دے کر بلاتے، مہاراج مہاراج، ان مہاراجوں کو دوسرے دکان داروں کے بنجے سے چہڑانے کیلئے اور خود گھسیٹ کر اپنے کچہار میں لے جانے کے

دوران اکثر ان کی پگڑیاں کھل کر پیروں میں الجھ جاتیں، اس سلسلے میں آپس میں اتنے جھگڑے اور ہاتھ پائی ہو چکی تھی کن منڈی کے تمام بیوپاریوں نے پنجابیتی فیصلہ کیا کہ گاہک کو صرف وہی دکان دار آواز دے کر بلا گا جس کی دکان کے آگے سے وہ گزرے گا، لیکن جیسے ہی وہ کسی دوسرے دکان دار کے حلقہ تشدد میں داخل ہوگا تو اسے کوئی اور دکان دار ہر گز نہیں آواز دے گا، اس کے باوجود چہینا جھپٹی اور کشم پچھاڑ بڑھتی رہی گئی تو ہر دکان دار کے آگے چونے سے حد بندی لائین کھینچ دی جائے گی، اس سے یہ فرق پڑا کہ کشتی بند ہوگئی، کبڈی ہونے لگی، بعض دکان داروں نے مار پیٹ، گاہکوں کا ہانکا کرنے اور انہیں ڈنڈا ڈولی کر کے اندر لانے کے لئے بگڑے پہلوان اور شہر کے چہٹے ہوئے شہدے اور مستنڈے پاٹ ٹائم ملازم رکھ لئے تھے، کساد بازاری اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی، یہ لوگ دن میں لکڑ منڈی میں گاہکوں کو ڈرا دھمکا کر ناقص اور کندم مال خریدواتے اور رات کو یہی فریضہ بازار حسن میں بھی انجام دیتے، بہت سے طوائفوں نے اپنی آبرو کو ہر ضب زیادہ سے زیادہ غیر محفوظ رکھنے کی غرض سے ان کو بطور پمپ ملازم چھوڑا تھا، قبلہ نے اس قسم کا کوئی غنڈا اور بد کردار پہلوان ملازم نہیں رکھا تھا، کہ انہیں اپنے بازوں پر پورا بہروسہ تھا، لیکن اوروں کی طرح مال کی چرائی کٹائی میں مار کٹائی کا خرچہ بھی شامل کر لیتے تھے۔

آلات اخراج خون: جونک، سینگ، لاٹھی

ہمہ وقت طیش کا عالم طاری رہتا تھا، انہوں نے پہلے سے موڈ بنا کر لیٹتے تھے، کہ انکے کہلتے ہی غصہ کرنے میں آسانی ہو، پیشانی کے تین بل سوتے میں بھی نہیں مٹتے تھے، غصے کی سب سے خالص قسم وہ ہوتی ہے، جو کسی اشتعال کی محتاج نہ ہو کسی بہت معمولی سے بات پر آجائے، غصے کے آخر ہوتے ہوتے یہ بھی نہیں یاد رہتا کہ آیا کہ کس بات پر تھا، بیوی ان کو روزہ رکھنے دیتی تھیں، غالباً ۱۹۳۵ کا واقعہ ہے، ایک دن عشا کی نماز کے بعد گڑ گڑا گڑا کر اپنی دیرینہ پریشانیاں دور کرنے کیلئے دعائیں مانگ رہے تھے، کہ ایک تازہ پریشانی کا خیال آئے ہی ایک دم جلال آگیا، دعا ہی میں کہنے لگے کہ تو نے میری پرانی پریشانی ہی کون سے رفع کر دیں، جو اب بین نئی پریشانی دور کرے گا اس رات مصالحتہ کرنے کے بعد پھر کبھی نماز نہیں پڑھی۔

ان کے غصے پر یاد آیا، کہ اس زمانے میں کن میلیے محلوں بازاروں میں پھیری لگاتے تھے، کان کامیل نکالنے پر ہی کیا موقوف، دنیا جہان کے کام گھر بیٹھے ہو جاتے ہیں، سبزی، گوشت اور سودا سلف کی خریداری، حجامت، تعلیم، زچگی، پیڑھی، کھاٹ، کھٹولے کی..... یہاں تک کہ خود اپنی مرمت بھی، سب گھر بیٹھے ہو جاتی، بیبیوں کے ناخن نہرنی سے کاٹنے اور پیٹھ ملنے کے لئے نائین گھر آتی تھیں، کپڑے بھی مغلانیاں گھر آکر سینیں تھیں، تاکہ محرموں کو ناپ تک کی ہوا نہ لگے، حالانکہ اس زمانے میں زنانہ پوشاک کے جو

نمونے ہماری نظر سے گزرے ہیں، وہ ایسے ہوتے تھے، کہ کسی بھی لیٹر بک سکا ناپ لیکر سیے جاسکتے تھے، غرض کہ سب کام گھر میں ہی ہوتے تھے، کہ موت تک گھر میں واقع ہوتی تھیں، اس کے لئے باہر جا کر کسی ٹرک سے اپنی روح قبض کروانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، فساد خون سے کسی کے بار بار پھوڑے پھنسی نکلیں،، یا دماغ میں خیالات فاسدہ کا ہجوم دن دھاڑے بھی رہنے لگے، تو گھر پر ہی فصد کہول دی جاتی ہے، فاضل و فاسد خون نکلوانے کی غرض سے اپنا سر پھڑوانے والے یا پھوڑنے کیلئے، کسی سیاسی جلسے میں جانے یا حکومت کے خلاف مظاہرے کر کے لاٹھی کھانے کی ضرورت پڑتی تھی، اس زمانے میں لاٹھی کو آلہ اخراج خون کے طور پر استعمال نہیں کیا جاتا تھا، جونک اور سینگی کے لگانے والی کنجریاں روز پھیری لگاتی تھیں، اگر اس زمانے میں کسی حکیم کا ہاتھ آج کل کے نوجوانوں کی نبض پر پڑ جائے تو کوئی نوجوان ایسا نہ بچے جس کے تہاں سینگی لگی نظر نہ آئے، رہے سہے ہم جیسے آج کل کے بزرگ کہ کی جس سے بات اس کو ہدایات ضرور کی تو کوئی بزرگ ایسا نہ بچے گا، کس کی زباں پر حکیم صاحبان جونک نہ لگوادیں۔

ہم واقعہ یہ بیان کرنے چلے تھے کہ گرمیوں کے دن تھے قبلہ ادلے کا قورمہ اور خربوزہ تناول فرما کر کین میں قیلو لہ کر رہے تھے، کہ اچانک کن ملیے نے کین کے دروازے پر بڑے زور سے آواز لگائی کہ کان کا میل، خدا جانے میٹھی نیند سو رہے تھے، یا کوئی بہت ہی حسین جواب دیکھ رہے تھے، جس میں گاہک ان سے تہنے داموں دھڑ ادھڑ لکڑی خرید رہے تھے، ہڑ بڑا کر آٹھ بیٹھے، ایک دفعہ تو دھل گئے، چق کے پاس پڑی ہوئی لکڑی اٹھا کر اس کے پیچھے ہولے، کمینے کی یہ جرات کن ان کے کان کے سے فقط ایک گزر دور بلکہ پاس ایسے گستے خانہ طریقے چیخنے، یہ کہنا تو درست نہ ہوگا، کہ آگے آگے وہ اور پھیچے پھیچے یہ، اس لئے قبلہ غصے میں ایسے بھرے ہوئے تھے کہ کبھی کبھی اس سے آگے بھی نکل جاتے، سڑک پر کچھ دور بہاگنے کے بعد کن میلیا گلیوں میں نکل گیا اور آنکھوں سے اوجھلک ہو گیا، مگر قبلہ محض اپنی چھٹی حس کی بتائی ہوئی سمت میں دوڑتے رہے اور یہ وہ سمت تھی جس طرف کوئی شخص جس کے پانچوں حواس سلامت ہوں، جارحانہ انداز میں لکڑی لاٹھی گھماتا ہر گز نہ جاتا کہ یہ تھانے کی طرف جاتے تھی، اس وحشیانہ دوڑ میں قبلہ کی لکڑی اور کن ملیئی کا پگڑ جس کے ہر پیچ میں اس نے میل نکالنے کے اوزار اڑس رکھے تھے، زمین پر گر گیا، اس میں سے ایک ڈبیا بھی نکلی جس میں اس نے کان کا میل جمع کر رکھا تھا، نظر بچا کر اسی میں تولہ بھر کر میل نکال کر دکھا دیتا کو دیکھو یہ تمہارے کام سی نکلا ہے، کسی کے کان سے گولر کے بہنگے برآمد کر کے کہتا ہے کہ تمہارے کان میں جو بہن بہن تن تن کی آوازیں آرہی تھیں، وہ انہیں کی تھیں لیکن یہ سچ ہے کہ وہ کان کی بہول بہلیوں میں اتنی دور تک سبج سبج

سلائی ڈالتا چلاجاتا تھا کہ محسوس ہوتا کہ ابھی کان کے راستے آنتیں بھی نکال کر ہتھیلی پر رکھ دے گا، قبلہ نے اس پگڑی کو ہکی پر چڑھا کر اپنی کبین کے سامنے اس طرح گاڑ دیا جیسا اگلے وقتوں میں کوئی بے صبر ولی عہد، یا وہ نہ ہو تو پھر کوئی دشمن، بادشاہ سلامت کا سرکاٹ کر نیزے پر ہر خاص و عام کی اطلاع کیلئے بلند کر دیتا تھا، اس کی دہشت ایسی بیٹھی کہ دکان کے سامنے سے بڑھئی، کھٹ بنئی، سینگ لگانے والیوں اور سحری کیلئے جگانے والوں نے بھی نکلنا چھوڑ دیا، ملحقہ مسجد کا کریہیہ السورت موذان بھی عقب والی گلی سے اُٹے جانے لگا۔

کانسی کی لٹیا، بالی عمریا اور چگی داڑھی

قبلہ اپنا مال بڑی توجہ، محنت اور محبت سے دکھاتے تھے، محبت کا اضافہ ہم نے اس لیے کیا کہ وہ گاہک کو تو شیر کی نظر سے دیکھتے، مگر اپنی لکڑیپر محبت سے ہاتھ پھیرتے رہتے، کوئی ساگو ان کا تختہ ایسا نہیں تھا، جس کے ریشوں کے ابر اور رگوں کا طغری، اگر وہ چاہیں تو، یادداشت سے کاغذ پر نہ بنا سکتے ہوں، لکڑی منڈی میں وہ واحد دکان دار تھے، جو گاہک کو اپنا اور ہر شہتیر اور بلی کا شجرہ نسب ازبر کر دیتے تھے، ان کا اپنا شجرہ نسب بلی سے بھی زیادہ لمبا تھا۔ اس پر اپنے جد اعلیٰ کو ٹانگ رکھا ہے، ایک بلی کی قامت زیبا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے، سوا انتالین فٹ لمبی ہے، گونڈھ کی ہے، افسوس اصغر گونڈھوی کے غوغائے شاعری نے گونڈھ کی بلیوں کی شہرت کا بیڑا غرق کر دیا، لاکہ کہو، اب کسی کو یقین ہی نہیں آتا کہ گونڈے کی اصل وجہ شہرت خوب صورت بلیاں تھیں، اصغر گونڈھوی سے پہلے ایسی سیدھی، بے گانٹھ بلی ملتی تھی، کہ چالیس فٹ اونچا سرے پر سے چھلاچھوڑ دو تو بے روک، سیدھا نیچے جہن سے آگے ٹھرتا ہے، ان کے ہاں کا ہر شہتیر اصیل اور خاندانی تھا، بیش تر خالص مغل یا روہیل کھنڈ کے پٹھان معلوم ہوتے تھے، کہ ہر آئے گئے کے کپڑے پہاڑ تے اور خود مشکل سے چرتے تھے، کبھی قبلہ کونے میں پڑے ہوئے گرم و سرد سیلاب چشیدہ تختے کی طرف اتنے ادب و احترام سے اشارہ کرتے گویا ابھی ابھی جودی پہاڑ کی ترائی سے کشتی نوح میں سے اکھاڑ کر بطور خاص ایک دانہ آپ کیلئے لے آئے ہیں، کبھی برمی ساگو ان کے لٹھے پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے، میاں ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے بچہ ہے، بہت سے بہت اسی سال ڈیڑھ ڈیڑھ سو سال کا ساگو ان ارادی کے جنگلوں میں آندھی طوفان میں بالکل کھڑی کمر استادرہتا ہے اور اس لیکن صاحب ہے بلا کا سیز نڈ، سیکڑوں بارشوں اور سات دریائوں کا پانی پیکر یہاں پہنچا ہے اور اس لٹھے پر تو مگر مچہ نے پیشاب بھی کیا ہے، انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے، یہ جو کنول نین گرہ نظر آرہی ہے، اس پر مگر مچہ جس لکڑی پر موت دے اس ک وحشر تک نہ دیمک لگتی ہے، نہ آگ لگتی ہے اس پر جواجہ عبدالحمیدجو منشیانہ ڈیسک کے لیے لکڑی خریدنے آئے تھے، پوچہ بہیٹے کی امگر مچہ کے

کھمبے سے بجائے درخت پر۔۔۔۔۔ وہ جملہ مکمل نہ کر پائے تھے کہ قبلہ تنک کر بولے جی نہیں، مگر مچہ تو سبیل اہل اسلام میں زنجیر سے بندھے ہوئے تین کے گلاس سے پانی پی کر، سڑک پر، ٹہل ٹہل کر استنجا سکھاتے ہیں، آپ کے والد صاحب کی طرح، آیا خیال شریف میں؟

بس چوبیس گھنٹے مزاج کی کچھ ایسی ہی جو الا مکھی کیفیت رہتی تھی، ایک دفعہ حاجی محمد اسحاق چمڑے والے کچھ خریدنے آئے، قبلہ یوں تو ہر قسم کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے، لیکن شمیم پر سچ مچ فریقہ تھے، اکثر فرماتے تخت طائوس میں شاہ جہاں نے شیشم ہی لگوائے تھی، شیشم کے گن گاہک اور قدر دان تو قبر میں جا سوئے، مگر کیا بات ہے شیشم کی جتان استعمال کروں اتنے ہی جوہر کہلتے ہیں، شیشم کی جس چارپائی اور دادا جان دونوں کی ولادت ہوئی تھی، اپنے حسن تولد و توارد کو قبلہ چارپائی اور دادا جان دونوں کے لئے باعث سعادت و افتخار سمجھتے ہیں، حاجی محمد اسحاق بولے، یہ لکڑی تو صاف معلوم نہیں ہوتی قبلہ نہ جانے کتنے برسوں بعد مسکرائے، حاجی صاحب کی داڑھی کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا، یہ بات ہم نے شیشم کی لکڑی، کانسی کی لٹیا، بالی عمریا اور چگی داڑھی میں ہی دیکھی کہ جتنا ہاتھ پھیرو اتنی ہی چمکتی ہے، اعلیٰ ذات کی شیشم کی پہچان یہ ہے کہ آرا، رندھ، برما سب کھنڈے کند اور ہاتھ شل ہو جائیں یہ چیز تھوڑا ہی ہے کہ ایک ذرا کیل ٹھونکو توالف سے لے کر تک چر جائے، پر ایک بات ہے، تازہ کٹی ہوئی چیڑ سے بن مہکار کا ایک آبشار پھوٹ پڑتا ہے لگتا ہے اس میں نہایا جا رہا ہوں، جس دن کارخانے میں چیڑ کیکٹائی ہونے والی ہو، اس دن میں عطر لگا کر نہیں آتا۔

سائی کے ساتھ عزت سادات بھی گئی یوں تو ان کی زندگی ڈیل کارنیگی کے ہر اصول کی اول تا آخر نہایت کامیاب خلاف ورزی تھی، لیکن، بزنس میں انہوں نے اپنے ہتھکنڈے الگ ایجاد کیے تھے، گاہک سے جب تک یہ نہ کہلوالیں کہ لکڑی پسند ہے، اس کی قیمت اشارتا بھی نہیں بتاتے تھے، وہ پوچھتا بھیتو صاف تال جاتے، آپ بھی کمال کرتے ہیں، آپ کو لکڑی پسند ہے، لے جائیے، گھر کی بات ہے، گاہک جب قطعی طعر پر لکڑی پسند کر لیتا تو قبلہ ویمت بتائے بغیر، ہاتھ پھیلا کر بیغانہ طلب کرتے۔

سستا سماں تھا، وہ دونوں ی اچونی کی سائی پیش کرتا جو اس سودے کیلئے کافی ہوتی، اشارے سے دہتکارتے ہوئے کہتے، چانڈی دکھائوں یعنی کم از کم ایک کلد اروپہ نکالو، وہ بے چارہ شرما حضوری ایک روپیہ نکالتا جو اس زمانے میں پندرہ سیر گیہوں یا سیر بہر اصلی گھی کے برابر ہوتا تھا، قبلہ روپیہ لے کر اپنی ہتھیلی پر اس طرح رکھے رہتے کہ اسے تسلی کے لئے نظر تو اتار رہے، مگر جھپٹانہ مار سکے، ہتھیلی کو اپنے زیادہ قریب بھی نہ لاتے، مبادا سودا ٹپنے سے پہلے گاہک بدک جائے کچھ دھر بعد خود کہتے مبارک ہو

سودا پکا ہو گیا، پھر قیمت بتاتے جسے سن کر وہ ہکا بکا رہ جاتا، وہ قیمت پر حجت کرتا تو کہتے عجیب گہن چکر آدمی ہو، سائی دے کر پھرتے ہوں، ابھی روپیہ دے کر سودا پکا کیا ہے ابھی تو اس میں تمہارا ہاتھ کی گرمائی بھی نہیں گئی اور ابھی پھر گئے، اچھا کہہ دو کہ یہ روپیہ تمہارا نہیں ہے، کہو کہ قیمت ناپ تول کر ایسی بتاتے کہ کائیاں سے کائیاں گاہک ددھا میں پڑ جاتا اور یہ فیچلہ نہ کر سکے کہ پیشگی ڈوبنے میں زیادہ نقچان ہے یا اس بہائو لکڑی خریدنے میں۔ دوران حجت کتنی ہی گرما گرمی بلکہ ہاتھ پائی ہو جائے وہ اپنی ہتھیلی کو چت ہے رکھتے، مٹھی کبھی بند نہیں کرتے تھے، تاکہ بے آبرو ہوتے ہوئے گاہک کو اطمینان رہے کہ کم از کم سائی تو محفوظ ہے، ان کے بارے میں ایک قصہ مشہور تھا، کہ ایک سر پھرے گاہک سے جھگڑا ہوا تو دھوبی پاٹ کا داؤں لہا کر زمین پر دے مارا اور چہاتی پر چڑھ کر بیٹھ گئے، لیکن اس پوز میں بھی اپنی ہتھیلی جس پر روپیہ رکھا تھا، چت ہی رکھی تاکہ اسے یہ بدگمانی نہ ہو کہ روپیہ ہتھینا چاہتے ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ جیسی بے داغ اور اعلیٰ لکڑی وہ بیچتے تھے، ویسی بقول ان کے تمہیں باغ بہشت میں شاخ طوبی سے بھی دستیاب نہ ہوگی، داغی لکڑی بندے نے آج تک نہیں بیچی، سو سال بعد بھی دیمک لگ جائے تو پورے دام واپس کر دوں گا، بات دراصل یہ تھی کہ وہ اپنے اصولوں کے پکے تھے، مطلب یہ کہ تمام عمر اونچی دکان، صحیح مال، ظلط مال پر سختی سے کار بند رہے، سنا ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے فیشن ایبل اسٹور ہیرڈز کا دعویٰ ہے کہ ہمارے پاس سوئی سے لے کر ہاتھی تک دستیاب ہے، کہنے والے کہتے ہیں، کہ قیمت بھی دونوں کی ایک ہوتی ہے، ہیرڈز اگر لکڑی بیچتا تو باخدا ایسی ہی اور ان ہی داموں بیچتا۔

یہ چھوڑ کر آئے ہیں

کانپور سے ہجرت کر کے کراچی آئے تو دنیا ہی اور تھی، اجنبی ماحول، بے روزگاری، بے گھری، اس پر مستزاد، اپنی آبائی حویلی کے دس بارہ فوٹو مختلف زاویوں سے کھنچو کر لائے تھے، ذرا یہ سائیڈ پوز دیکھے، اور یہ شارٹ تو کمال کا ہے، ہر آئے گئے کو فوٹو دکھا کر کہتے یہ چھوڑ کر آئے ہیں، جن دفاتروں میں مکان کے الاٹ منٹ کی درخواستیں دی تھیں، ان کے بڑے افسروں کو بھی کٹھرے کے اس پار سے تصویری ثبوت، استحقاق دکھاتے، یہ چھوڑ کر آئے ہیں، واسکٹ اور شیروانی کی جیب میں اور کچھ ہو یا نہ ہو حویلی کا فوٹو ضرور ہوگا، یہ درحقیقت ان کا وزیٹنگ کارڈ تھا، کراچی کے فلیٹوں کو کبھی ماچس کی ڈبیا، کبھی ڈرے، کبھی کابک کہتے، لیکن جن تین مہینے جوتیاں چٹخانے کے باوجود ایک کابک میں سر چہپانے کو جگہ نہ ملی تو آنکھیں کہلیں، احباب نے سمجھایا فلیٹ ایک گہنٹے میں مل سکتا ہے، کسٹوڈین کی ہتھیلی پر پیسا رکھو اور جس فلیٹ کی چاہو چابی لے لو، مگر قبلہ تو اپنی ہتھیلی پر پیسا رکھوانے کے عادی تھے، وہ کہاں مانتے، مہینوں فلیٹ

الٹ کروانے کے سلسلے میں بھوکے پیاسے، پریشان حال سرکاری دفاتروں کے چکر کاٹتے رہے، زندگی بھر کسی کے ہاں مہمان نہ رہے اب بیٹی داماد کے ہاں مہمان رہنے کا عذاب بھی سہا۔  
اب کیا ہوئے گا؟

انسان جب کسی گہلا دینے والے کرب یا آزمائش سے گزرتا ہے تو ایک ایک ساعت ایک ایک برس بن جاتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے ہر برس کے ہوں دن چاس ہزار بیٹی کے گھر ٹکڑے توڑنے یا اس پر بار بننے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، کانپور میں کبھی اس کے ہاں کھڑے کھڑے ایک گلاس پانی پیتے تو ہاتھ پر پانچ دس روپے رکھ دیتے، لیکن اب؟ صبح سر جھکائے ناشتہ کر کے نلکتے تو دن بھر خاک چھان کر مغرب سے ذرا پہلے لوٹتے، کھانے کے وقت کہہ دیتے کہ ایرانی ہوٹل میں کھا کر آیا ہوں، جوتے انہوں نے ہمیشہ رحیم بخش جفت ساز سے بنوائے، ان جوتوں کے تلے اب اتنے گھس گئے تھے، کہ چر چرانے کے لائق نہ رہے، پیروں میں ٹھیکیں پڑ گئیں، شیروانیاں ڈھیلی ہو گئیں، بیمار بیوی رات کو درد سے کراہ بھی نہیں سکتی تھیں، کہ سمدھیانے والوں کی نیند خراب ہونے کا اندیشہ تھا، مملکے کرتوں کی لکھنوی کڑھائی میل میں چھپ گئی، چنٹیں نکلنے کے بعد آستینیں انگلیوں سے ایک ایک بالٹ نیچے لٹکی رہتیں، خضابی مونچھوں کا بل تو نہیں گیا، لیکن صرف بل کھائی ہوئی نوکیں سیاہ رہ گئیں، چار چار دن نہانے کو پانی نہ ملتا، موتیا کا عطر لگائے تین مہینے ہو گئے۔

بیوی گھبرا کر بڑے بھولپن سے مضافاتی لہجے میں کہتیں، اب کیا ہوئے گا؟، ہوگا کے بجائے ہوئے گا، ان کے منہ سے بہت پیارا لگتا تھا، اس ایک فقرے میں وہ اپنی ساری سراسیمگی، معصومیت، بے بسی اور مخاطب کے علم نجوم اور اس کے بے طلب مدد پر بھروسا..... سبھی کچھ سمودیتی تھیں، قبلہ اس کے جواب میں ہمیشہ بڑے اعتماد اور تمکنت سے دیکھتے ہیں، کہہ کر ان کی نشفی کر دیتے تھے۔

یہ زور دست و ضربت کاری کا ہے مقام ہر دکہ، ہر عذاب کے بعد زندگی آدمی پر ایک راز کھول دیتی ہے، بودھیہ گیا کی چھاؤں تلے بدھ بھی ایک دکہ بھری تپسیا سے گزرے تھے، جب پیٹ پیٹھ سے لگ گیا، آنکھیں اندھے کنوئوں کی تہ میں بے نور ہوئیں، اور ہڈیوں کی مالا میں بس سانس کی ڈوری اٹکی رہ گئی، تو گو تم بدھ پر بھی ایک بھید کہل تھا، جیسا اور جتنا اور جس کارن آدمی دکہ بھوگتا ہے، ویاس ہی بھید اس پر کھلتا ہے، نروان ڈھونڈنے والے کو نروان مل جاتا ہے، اور جو دنیا کی خاطر کشت اٹھاتا ہے تو دنیا اس کو راستہ دیتی چلی جاتی ہے۔

سو گلی خاک چھانکنے اور دفتر دفتر دھکے کھانے کے بعد قبلہ کے قلب حزیں پر کچھ القا ہوا، وہ یہ کہ قاعدے قانون دانوں اور جابروں نے کمزور دل والوں

کو قابوں میں رکھنے کیلئے بنائے ہیں، جو شخص ہاتھی کی لگام ہی تلاش کرتا رہ جائے، وہ کبھی اس پر چڑھ نہیں سکتا، جام اس کا ہے جو بڑھ کر خود ساقی کو جام و مینا سمیت اٹھالے، بالفاظ دیگر، جو بڑھ کر تالے توڑ ڈالے، مکان اسے کا ہو گیا، کانپور سے چلے تو اپنی جمع جتھا، شجرہ، اسپرنگ سے کھلنے والا چاقو، اختری ہائی فیض آبادی کے تین ریکارڈ، مراد آبادی حقے اور صراحی کے سبز کیریر اسٹنڈ کے علاوہ اپنی دکان کاتالا بھی ڈھو کر لے آئے تھے، علی گڑھ سے حاصل طور پر بنوا کر، تین سیر کم کانہ ہوگا، مذکورہ بالا القا کے بعد بزنس روڈ پر ایک اعلیٰ درجے کا فلیٹ اپنے لیے پسند فرمایا، ماربل کی ٹائلز، سمندری ہوا کی رخ کھلنے والی کھڑکیاں جن میں رنگین شیشے لگے تھے، دروزے کے زنگ آلود تالے پر اپنے علیگ تالے کی ایک ہی ضرب سے فلیٹ میں اپنی آباد کاری بلا منت سرکار کر لی، گویا پروفیسر قاضی عبدالقدوس کے الفاظ میں، اولال لذکر کو ثانی الزکرت پر مار کر آخر الزکر کا قبضہ لے لیا، تختی دوبارہ پینٹ کروا کے لگادی، اس سے پہلے اس پر کسٹوڈین متروکہ املاک کا نام لکھا تھا، قبلہ عالم جلال میں اس وہیں سے کیلوں سمیت اکھاڑ لائے تھے، تختی پر نام کے آگے، مضطر کانپوری بھی لکھو ادیا، پرانے واقف کاروں نے پوچھا کہ آپ شاعر کب سے ہو گئے، فرمایا میں نے آج تک کسی شاعر پر دیوانی مقدمہ چلتے نہیں دیکھا، نہ ڈگری، قرقی ہوتے دیکھی۔ فلیٹ پر قابض ہونے کے کوئی چار ماہ بعد قبلہ چاڑی دار کا گھنٹارفو کر رہے تھے کہ کسی نے بڑے گستاخانہ انداز سے دروازہ کھٹکھٹایا، مطلب یہ کہ نام کی تختی کو پھٹ پھٹایا، جیسے ہی انہوں نے بڑ بڑا کر دروازہ کھولا، آنے والے نے خود کا تعارف اس چرح کروایا کہ گویا اپنے عہدے کی چیڑ اس ان کے منہ پر اٹھا کر دے ماری ہو، افسر، محکمہ کسٹوڈین ایویکوی پراپرٹی، پھر ڈپٹ کر کہا بڑے میاں فلیٹ کا الاٹ منٹ آرڈر دکھاؤ، قبلہ نے واسکٹ کی جیب سے حویلی کا فوٹو نکال کر دیکھا یا، یہ چھوڑ کر آئے ہیں، اس نے فوٹو کا نوٹس نہ لیتے ہوئے قدرے درشتی سے کہا، بڑے میاں سنا نہیں کیا، الاٹ منٹ آرڈر دکھاؤ، قبلہ نے بڑی رسان سے اپنے بائیں پیر کا سلیم شاہی جوتا اتارا، اور اتنی ہی رسان سے کہ اس کو گمان تک نہ ہوا کیا کرنے والے ہیں، اس کے منہ پر مارتے ہوئے بولے یہ ہے یاروں کا الاٹ منٹ آرڈر، کاربن کاپی بھی ملاحظہ فرمائیے گا، اس نے اب تک یعنی تا دم تذلیل، رشوت کھائی، جاتے نہیں کھائے تھے، پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا۔

جس حویلی میں تھا ہمارا گھر

قبلہ نے بڑے جتن سے لی مارکیٹ میں ایک چھوٹی سے لکڑی کی دکان کا ڈول ڈالا، بیوی کے جہیز کے زیور اور ویلی اسکاٹ کی بندوق اونے پونے بیچ ڈالی، کچھ مال ادھار خریدا، ابھی دکان ٹھیک سے جمی بھی نہیں تھی کہ ایک انکم

ٹیکس انسپیکٹر آنکلا، کھاتے ، رجسٹریشن، روکڑبھی، اور رسید بک کی طلبی کیں، دوسرے دن قبلہ ہم سے کہنے لگے ، مشتاق میاں سنا ہے آپ نے؟ مہینوں جوتیاں چٹخاتا، دفتروں میں اپنی اوقات خراب کرواتا پھرا ، کسی نے پلٹ کر نہ پوچھا کہ بھیا کون ہو ، اب دل لگی دیکھیے ، کال ایک انکم ٹیکس کا تیس مار خان دنداناتا ہوا آیا، لقمہ کبوتر کی طرح سینہ پھیلائے ، میں نے سالے کو یہ دکھادی، یہ چھوڑ کر آئے ہیں، چندرا کر پوچھنے لگا، یہ کیا ہے؟ ہم نے کہا ہمارے ہاں اس محل سرا کہتے ہیں۔

سچ جھوٹ کا حال مرزا جانیں کہ انہیں سے روایت ہے کہ اس محل سرا کا ایک بڑا فوٹو فریم کروا کے اپنے فلیٹ کی کاغذی سی دیورا میں کیل ٹھونک رہے تھے کہ دیورا کے اس پار والے پٹوسی نے آکر درخواست کی ذرا کیل ایک فٹ اوپر ٹھونکیں تاکہ دوسرے سرے پر میں اپنی شیروانی لٹکا سکوں ، دروازے زور سے کھولنے اور بند کرنے کی دھمکی سے اس زنگیائی کیل پر ساری محل سرا پنڈولم کی طرح جھولتی رہتی تھی، گھر میں ڈاکیا یا نئی دھوبن بھی آتی تو اسے بھی سکھاتے یہ چھوڑ کر آئے ہیں۔

اس حویلی کا فوٹو ہم نے بھی بار بار دیکھا، اس سے دیکھ کر ایسا لگتا تھا، جیسے کیمرے کو موٹا نظر آنے لگا ہے ، لیکن کمرے کے ضعف بصارت کو قبلہ اپنے زور بیان سے دور رکھتے تھے ، یوں بھی ماضی ہر شے کے گرد ایک رومانی ہالہ کھینچ دیتا ہے ، گزرا ہوا بھی سہانا لگتا ہے ، آدمی کا جب کچھ چہن جائے تو وہ مست ملنگ ہو جاتا ہے کسی فینٹسی لینڈ میں پناہ لیتا ہے۔

جس حویلی میں تھا ہمارا گھر

قبلہ نے بڑے جتن سے لی مارکیٹ میں ایک چھوٹی سے لکڑی کی دکان کا ڈول ڈالا، بیوی کے جہیز کے زیور اور وییلی اسکاٹ کی بندوق اونے پونے بیچ ڈالی ، کچھ مال ادھار خریدا ، ابھی دکان ٹھیک سے جمی بھی نہیں تھی کہ ایک انکم ٹیکس انسپیکٹر آنکلا، کھاتے ، رجسٹریشن، روکڑبھی، اور رسید بک کی طلبی کیں، دوسرے دن قبلہ ہم سے کہنے لگے ، مشتاق میاں سنا ہے آپ نے؟ مہینوں جوتیاں چٹخاتا، دفتروں میں اپنی اوقات خراب کرواتا پھرا ، کسی نے پلٹ کر نہ پوچھا کہ بھیا کون ہو ، اب دل لگی دیکھیے ، کال ایک انکم ٹیکس کا تیس مار خان دنداناتا ہوا آیا، لقمہ کبوتر کی طرح سینہ پھیلائے ، میں نے سالے کو یہ دکھادی، یہ چھوڑ کر آئے ہیں، چندرا کر پوچھنے لگا، یہ کیا ہے؟ ہم نے کہا ہمارے ہاں اس محل سرا کہتے ہیں۔

سچ جھوٹ کا حال مرزا جانیں کہ انہیں سے روایت ہے کہ اس محل سرا کا ایک بڑا فوٹو فریم کروا کے اپنے فلیٹ کی کاغذی سی دیورا میں کیل ٹھونک رہے تھے کہ دیورا کے اس پار والے پٹوسی نے آکر درخواست کی ذرا کیل ایک فٹ اوپر ٹھونکیں تاکہ دوسرے سرے پر میں اپنی شیروانی لٹکا سکوں ، دروازے زور سے کھولنے اور بند کرنے کی دھمکی سے اس زنگیائی کیل پر ساری محل سرا پنڈولم کی طرح جھولتی رہتی تھی، گھر میں ڈاکیا یا نئی دھوبن

بھی آتی تو اسے بھی سکھاتے یہ چھوڑ کر آئے ہیں۔  
اس حویلی کا فوٹو ہم نے بھی بار بار دیکھا، اس سے دیکھ کر ایسا لگتا تھا،  
جیسے کیمرے کو موٹا نظر آنے لگا ہے، لیکن کمرے کے ضعف بصارت کو  
قبلہ اپنے زور بیان سے دور رکھتے تھے، یوں بھی ماضی ہر شے کے  
گردایک رومانی ہالہ کھینچ دیتا ہے، گزرا ہوا بھی سہانا لگتا ہے، آدمی کا جب  
کچھ چہن جائے تو وہ مست ملنگ ہو جاتا ہے کسی فینٹسی لینڈ میں پناہ لیتا ہے۔

وہ ازحام کہ عقل دھرنے کی جگہ نہیں

حویلی کے چندا اندرونی کلوز اپ بھی تھے، کچھ کیمرے کی آنکھ اور کچھ چشم  
تصور کے رہیں، منت، ایک سہ دری تھی جس کی دو محرابوں کی دراڑوں میں  
بازنطنیی اینٹوں پر کانپوری چڑیوں کے گھونسلے نظر آرہے تھے، ان پر  
مورش آرچیز کی تہمت تھی، چراغ رکھنے کا ایک آلہ طاقت ایسے آرٹسٹک  
زاویے سے ڈبا تھا کہ پرتگالی آرچ کے آثار دکھائی دیتے تھے، فوٹو میں اس  
کے پہلو میں ایک چوبی گھڑونچی نظر آرہی تھی، جس کا شاہ جہانی ڈیزاین ان  
کے جدنے آب دار خانہ خاص سے بدست خود چرایا تھا، شاہ جہانی ہو یا نہ  
ہو، اس کے مغل میں کوئی شعبہ نہ تھا، اس لیے کہ اس کی ایک ٹانگ تیموری  
تھی، حویلی کی غلام گردشیں فوٹو میں نظر آرہی نہیں آرہی تھیں، لیکن ایک  
ہمسائے کا بیان ہے کہ ان میں گردش کے مارے خاندانی بڑے بوڑھے رلے  
پہرتے ہیں، شمالی حصے میں ایک ستون جو مدتیں ہوئیں چھت کا بوجہ اپنے  
اوپر سے اوچھے کے احسان کی طرح اتار چکا تھا، رومن پلرز کا نادر نمونہ  
بتایا جاتا تھا، حیرت تھی کہ یہ چھت سے پہلے کیوں نہ گرا، اس کی ایک وجہ یہ  
ہوسکتی ہے کہ چاروں طرف گردن گردن ملبے میں دبے ہونے کے باعث، اس  
کے گرنے کیلئے کوئی خالی جگہ نہ تھی ایک شکستہ دیورا کے ساتھ لکڑی کی  
بوسیدہ نسینی سیڑھی اس طرح کھڑی تھی کہ یہ کہنا مشکل تھا کہ کون کس کے  
سہارے کھڑا ہے، ان کی بیان کے مطابق جب دوسری منزل منہدم نہیں ہوئی  
تھی تو یہاں وکٹورین اسٹائل کا گرینڈ اسٹیر کیس ہوا کرتا تھا، اس غیر موجود  
چھت پر جہاں اب چمگادڑیں بھی لٹک نہیں لٹک سکتی، قبلہ ان آہنی کڑیوں کی  
نشان دہی کرتے جن میں دادا کے زمانے میں المانوی فانوس لٹکے رھتے تھے،  
جن کی چمچی روشنی میں دو گھنگرالی خنجریاں بحتیں جو کبھی دو کوہان  
والے باختری اونٹوں کی مخمل نشینوں کے ساتھ آئی تھیں، اگر یہ فوٹوں کی رنہ  
کمنڑی کے ساتھ نہ دیکھے ہوتے تو کسی طرح یہ قیاس و ذہن میں نہیں آتا سکتا  
تھا کہ پانچ سو مربع گز کی ایک لڑ کھڑاتی حویلی میں اتنے فنون تعمیر اور  
ڈھیر ساری تہذیبوں کا ایسا گھمسان ازحام ہوگا کہ عقل دھرنے کی جگہ نہ  
رھے گی، پہلی مرتبہ فوٹو دیکھیں تو خیال ہوتا تھا، کہ کیمرا ہل گیا ہے، پھر  
ذرا غور سے دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ ڈھنڈار حویلی اب تک کیسے

کھڑی ہے، مرزا کا خیال تھا کہ اب اس میں گرنے کی بھی طاقت نہیں ہے۔

وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

حویلی کے صدر دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر جہاں فوٹو میں گھورے پر ایک کالا مرغا گردن پھیلانے اذان دے رہا تھا، وہاں ایک شکتہ چبوترے کے آثار نظر آرہے تھے، اس کے پتھروں کے جوڑ اور درزوں میں سے پودے روشنی کی تلاش میں گھبرا کے باہر نکل پڑے تھے، ایک دن اس چبوترے کی طرف اشارہ کر کے فرمانے لگے، کہ یہاں اب مصفا سے لبریز سنگ سرخ کا ہشت پہلو حوض ہوا کرتا تھا، جس میں ولایتی گولڈ فیش تیرتی رہتی تھیں، عارف میاں اس میں پاپونیر خبار کی کشتیاں تیرایا کرتے تھے، یہ کہتے کہتے قبلہ جوش و بیان میں اپنی چھڑی لے کر کھڑے ہوئے، اس سے پھٹی ہوئی دری پر ہشت پہلو حوض کا نقشہ کھینچنے لگے، ایک جگہ فرضی لکیر قدرے ٹیڑھی کھینچ تو اسے پیر سے رگڑ کر مٹایا، چھڑی کی نوک سے اس بد ذات مجھلی کی طرف اشارہ کیا جو سب سے لڑتی پھرتی تھی، پھر ایک کونے میں اس مجھلی کی بھی نشان دہی کی جس کا جی ماندھ تھا، انہوں نے کھل کر تو نہیں کہا کہ آخر ہم ان کے خور تھے، لیکن ہم سمجھ گئے کہ مجھلی کا جی کھٹی چیزیں اور سوندھی مٹی کو کھانے کو بھی چاہ رہا ہوگا۔

قبلہ کبھی ترنگ میں آتے تو اپنے اکلوتے بے تکلف دوست رئیس احمد قدوائی سے فرماتے کہ جوانی میں مٹی جون کی ٹیک دوپہر یا میں ایک حبسین دوشیزہ کا کوٹھوں کوٹھوں ننگے پیر ان کی حویلی کی تپتی چھت پر آنا، اب تک مع ڈائیلگ یاد ہے، یہ بات مرزا کی سمجھ میں آج تک نہیں آئی، اس لیے کہ ان حویلی سے منزلہ تھی، جب دائیں بائیں پڑوس کے دونوں مکان ایک ایک منزلہ تھے، حسین دوشیزہ اگر ننگے پیر ہو اور زیور حیا اتارنے کیلئے اتولی ہو رہی ہوں تب بھی یہ کرتب ممکن نہیں، ناواقفے کہ حسینہ ان کے عشق میں دوشیزہ ہونے کے علاوہ دو لخت بھی ہے ہوجائے پلکھنفوٹو میں حویلی کے سامنے ایک چہتار پلکھن اداس کھڑی ہے، اس کا تخم ان کے جد اعلیٰ سمندر سیاہ زانو پر سوار، کارچوبی کام کے چغے میں چھپا کر قحط کے زمانے میں دمشق سے لائے تھے، قبلہ کے قول کے مطابق، ان کے پر دادا کے اباجان کہا کرتے تھے، کہ بے سروسامانی کے عالم میں یہ ننگ خلائق، ننگ اسلاف، ننگ وطن، ننگے سر، ننگے پیر، گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر، ننگی تلوار ہاتھ میں لیے، خیبر کے سنگلاخ ننگے پہاڑوں کو پہلانگتا، وارد ہندوستان ہوا، جو تصویر وہ فخریہ کھینچتے تھے، اس سے تو یہ ہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس وقت بزرگوار کے پاس ستر پوشی کے لیئے گھوڑوں کی دم کے سوا اور کچھ نہ تھا، جائداد، محل سرا، خدام، مال و متاع..... سب کچھ وہیں چھوڑ آئے، البتہ اثاث البیت کا سب سے قیمتی حصہ یعنی شجرہ نسب اور پلکھن کا تخم ساتھ لے آئے، گھوڑا جو انہی کی طرح نجیب الطرفین اور وطن مالوف سے بیزار تھا، تخم اور

شجرے کے بوجہ سے رانوں تلے سے نکلا پڑ رہا تھا۔

شجرے کی ہر شاخ پہ نابغہ بیٹھا تھا

زندگی کی دھوپ جب کڑی ہوئی اور پیروں تلے زمین جائداد نکل گئی تو آئندہ نسلوں نے اسی شجر اور شجرے کے سائے تلے بسرام کیا، قبلہ کو اپنے بزرگوں کی ذہانت و فطانت پر بڑا ناز تھا، ان کا ہر بزرگ نادر ہر روزگار تھا اور ان کے شجرے کی ہر شاخ پر ایک نابغہ بیٹھا اونگ رہا تھا۔ قبلہ نے ایک فوٹو اس پلکھن کے نیچے اس جگہ کھڑے ہو کر کہینچوایا تھا، جہاں ان کی نال گڑی تھی، فرماتے تھے، اگر کسی تخم ناتحقیق کو میری حویلی کی ملکیت میں شبہ ہو تو نال نکال کر دیکھ لے جب آدمی کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس کی نال کہاں گڑی ہے، اور پرکھوں کی ہڈیاں کہاں دفن ہیں، تو وہ منی پلانٹ کی طرح ہو جاتا ہے جو مٹی کے بغیر صرف بوتلوں میں پھلتا پھولتا ہے، اپنی نال، پرکھوں اور پلکھن کا ذکر اتنے فخر، غلو اور کثرت سے کرتے کرتے یہ احوال ہوا کہ پلکھن کی جڑیں شجرے میں اتر آئیں، جیسے گھٹنوں میں پانی اتر جاتا ہے۔

امپورٹڈ بزرگ اور یونانی ناک

وہ زمانے اور تھے، شرافت اور نجابت کے معیار بھی مختلف تھے، جب تک بزرگ اصلی امپورٹڈ یعنی ماورا النہری اور خیبر کے اس پار سے آئے ہوئے نہ ہوں، کوئی ہندوستانی مسلمان خود کو عزت دار اور نجیب نہیں گردانتا تھا، غالب کو تو شیخی بگہارنے کے لئے اپنا فرضی استاد ملا عبدالصمد تک ایران سے امپورٹ کرنا پڑا، قبلہ کے بزرگوں نے جب بے روزگاری اور عسرت سے تنگ آکر وطن چھوڑا تو انکھیں نم اور دل گذزار تھے، بار بار اپنا دست افسوس زانوئے اسپ پر مارتے اور ایک راوی شیوہ بیان کے بقول ایک دوسرے کی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر استغفر اللہ، استغفر اللہ کہتے، تازہ ولایت جس سے ملے، اپنے حسن اخلاق سے اس بات کا دل جیت لیا۔

پہلے جان، پھر جان جان، پھر جانے جانے ہو گئے، پھر ہی پیارے لوگ بتدریج، پہلے خاں، پھر خان خاں، پھر خان خاناں ہو گئے، حویلی کے آر کی ٹیکچیر کی طرح قبلہ کے امراض بھی شاہانہ ہوتے تھے، بچپن میں دائیں رخسار پر غالباً آموں کی فصل میں پھنسی نکلی تھی، جس کا داغ ہنوز باقی تھا، فرماتے تھے، جس سال میرے یہاں رنگ زیبی پھوڑا نکلا، اسی سال بلکہ اسی ہفتے میں ملکہ وکٹوریہ رانڈ ہوئی، ساٹھ کی پیٹھے میں آئے تو شاہجہانے حبس بول میں مبتلا ہو گئے، فرماتے تھے کہ غالب مغل بچہ تھا، ستم پیشہ ڈومنی کو اپنے زہر عشق سے مار ڈالا، مگر خود اسی، گویا کہ میرے والے عارضے میں مرا، ایک خط میں مرقوم ہے کہ جر عہ جر عہ پیتا ہو اور قطرہ

قطرہ خارج کرتا ہوں، دمے کا دورہ ذرا تھمتھما تو قبلہ بڑے فخر سے فرماتے کہ فیضی ککو بھی یہی مرض لاحق تھا، اس نے ایک قطعے میں کہا ہے، کہ وہ دو عالم میرے سینے میں سما گئے، مگر آدھا سانس کسی طور پر نہیں سمارہا، اپنے والد مرحوم کے بارے میں فرماتے تھے، کہ راج روگ یعنی اکبری سنگر ہنی میں انتقال فرمایا، مراداس سے آنتوں کی ٹی بی تھی، مرض تو مرض قبلہ کی ناک تک اپنی نہیں تھی، یونانی بتاتے تھے۔

مردہ از غیب بروں آیدو کارے بکند

قبلہ کو دو غم تھے، پہلے غم ک ذکر بعد میں آئے گا، کہ وہ جاں گسل تھا، دوسرا غم دراصل اتنا ان کا اپنا نہیں جتنا بیوی کا تھا جو بیٹے کی تمنا میں گھل رہی تھی، اس غربت نے بڑی منتیں مانیں، قبلہ کو شربت میں نقش گھول گھول کر پلائے، ان کے تکیے کے نیچے تعویذ رکھے، چھپ چھپ کر مزاروں پر چاردریں چڑھائیں، ہمارے ہاں لوگ جب زندوں سے مایوس ہو جاتے ہیں، تو ایک ہی آس باقی رہ جاتی ہے، مردہ از غیب بروں آیدو کارے بکند۔

پچاس میل کے دائرے میں کوئی مزار ایسا نہ بچا جس کے سرہانے کھڑے ہو کر وہ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر نہ روئی ہوں، کہ اہلقبر کے پسماندگان بھی تدفین کے وقت یوں نہ روئے ہوں گے، اس زمانے کے اہل القبور، صاحب کرامات ہوں یا نہ ہوں کم از کم قبر کے اندر ضرور ہوتے تھے، آج کل جیسا حال نہیں تھا کہ مزار اگر خالی از میت ہے تو غنیمت جانیے، ورنہ اللہ جانے اندر کیا دفن ہے، جس کا اس دھوم سے عروس شریف منایا جا رہا ہے، کوئی دن نہیں جاتا کہ کراچی کے اخباروں میں ایسے اشتہارات نہ ہوں کہ آج فلاں کا آسانہ عالیہ پر چادر شریف چڑھائی جا رہی ہے، پانچ بجے گاگر شریف، جلوس کیشکل میں لے جائی جائے گی، پھر اس سے مزار شریف کو غسل دیا جائے گا، بعد نماز مغرب لنگر شریف تقسیم ہوگا، ہم نے بعض نودریافت بزرگوں کے نوتعمیر مزاروں کے ضمن میں تشریف پر تاکید اتنا زور دیکھا کہ دل میں طرح رح کے وسوسے اٹھنے لگے، ہم نہ ضعیف العققاد ہیں، نہ وہابی، لیکن کراچی کے مزار کے بارے میں جو ہمارے سامنے پر ہوا ہے، ہم باعلان یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس متعلق ہر چیز شریف ہے سوائے صاحب مزار کے۔ خیر یہ تو ایک جملہ متعرضہ تھا جو جوانی میں پھیل کر پورا پیرا بن گیا، عرض یہ کرنا تھا کہ قبلہ خود کو کسی زندہ پیر سے کم نہیں سبجھتے تھے، انہیں جب پتہ چلا کہ بیوی اولاد نرنیہ کی منت مانگنے چوری چھپے نا محرموں کے مزار پر جانے لگی ہیں، تو بہت ناراض ہوئے، وہ جب بہت خفا ہوتے تو کھانا چھوڑ دیتے تھے، حلوائی کی دکان سے ریڑی، موتی چور کے لڈوں اور کچھوری لاکر کھا لیتے، دوسرے دن بیوی کا نسی کے رنگ کا دوپٹہ اوڑھ لیتیں اور انکے پسندیدہ کھانے یعنی دو پیاز، ڈیورٹھی شکر والا زردہ، بہت تیز مچوں کے ماش کے دھی بڑے کھلا کے انہیں منالیتیں، قبلہ اٹھی

مرغوبات پر اپنے ایرانی اور عربی النسل بزرگوں کی نیاز دلواتے، البتہ ان دہی بڑوں میں مرچیں برائے نام ڈالواتے، مزاروں پر حاضری پر قد غن بڑھ جاتا، بیوی بہت روئیں دہوئیں تو قبلہ کچھ پگھلے، مزاروں پر جانے کی اجازت دے دی، مگر اس شرط پر مزار کا مکین ذات کا کمبوہ نہ ہو، کمبوہ مرد اور غزل گو شاعر سے پردہ لازم ہے، خواہ مردہ ہی کیوں نہ ہوں، میں ان کے رگ وریشہ سے واقف ہوں، ان کے دشمنوں سے روایت ہے کہ قبلہ خود بھی جوانی میں شاعر اور نہیال کے طرف سے کمبوہ تھے، اکثر فرماتے مرگ کمبوہ جشنے دارد۔

کٹ کھنے بلاؤ کے گلے میں گھنٹی

رفتہ رفتہ بیوی کو صبر آگیا، ایک بیٹی تھی، قبلہ کو وہ عزیز سے عزیز تر ہوتی چلی گئی، انہیں اس حد تک صبر آگیا، کہ اکثر فرماتے، خدا بڑا رحیم و کریم ہے، اس نے بڑا فضل کیا بیٹا نہ دیا، اگر مجھ پر پڑتا تو تمام عمر خوار ہوتا اور اگر نہ پڑتا تو عاق کر دیتا۔

سیانی بیٹی، کتنی بھی چہیتی ہو،، ماں باپ کی چہاتی پر پہاڑ ہوتی ہے، لڑکی، ضرورت رشتہ کی اشتہاری اصطلاحوں کے مطابق، قبول صورت، سلیقہ شعار، خوش اطوار، امور خانہ، داری سے بخونی واقف، لیکن کس کی شامت آئی تھی، کہ قبلہ کی بیٹی کا پیام دے، ہمیں آتش نمر دو میں کودنے کا ذاتی تجربہ نہیں، لیکن وثوق سے نہیں کہہ سکتے، ہیں کہ آتش نمرود میں بے خطر کودنے سے کہیں زیادہ خطرناک کام نمرود کے شجرہ نسب میں کود پڑنا ہے، جیسا کہ پہلے عرض کرچکے ہیں، قبلہ ہمارے دوست بشارت کے پھوپھا، چچا اور اللہ جانے کیا کیا لگتے تھے، دکان اور مکان دونوں اعتبار سے پڑوسی بھی تھے، بشارت کے والد بھی رشتے کے حق میں تھے، لیکن رقعہ بھیجنے سے صاف انکر کر دیا کہ بہو کے بغیر پھر بھی گزارا ہوسکتا ہے، لیکن ناک اور تانگ کے بغیر تو شخصیت نا مکمل سی ہوگی، بشارت نے ریل کی پٹری سے خود کو بند ہوا کر بڑی لائن کے انجن سے اپنی خود کشی کی دھمکی دی، رسیوں سے بندھوانے کے بعد شرط خود اس لیے لگا دی، کہ عین وقت پر اٹھ کر بھاگ نہ جائیں، لیکن ان کے والد نے صاف کہہ دیا کہ اس کٹ کھنے بلاؤ کے گلے میں تمہی گھنٹی ڈالو قبلہ مد بغ بد لحاظ منہ پھٹ مشہور ہی نہیں تھے بھی، و ہ دل سے --- بلکہ بے دلی سے بھی --- کسی کی عزت نہیں کرتے تھے، دوسرے کو حقیر سمجھنے کا کچھ نہ کچھ جواز ضرور نکال لیتے مثلاً کسی کی عمر ان سے ایک مہینے بھی کم ہو تو اس کو لونڈا اور اگر ایک سال زیادہ ہو تو بڑبو۔

ب و س ہ اور چار نقطے

بشارت نے ان دنوں بی اے کا امتحان دی کیا تھا اور پاس ہونی کا امکان، بقول

ان کے ، فقٹی فٹی تھا، فقٹی فٹی اتنے زور سے اور فخریہ انداز میں کہتے تھے، گویا اپنی کانٹا تول نصفاً نجف نالائقی سے ممتحن کو کڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے، فرصت ہی فرصت تھی، کیرم اور کوٹ پیس کھیلتے تھے، روحوں کو بلاتے اور ان سے ایسے سوالات کرتے کہ زندوں کو شرم آجائے، کبھی دن بھر بیٹھے نظیر اکبر آبادی کے کلیات میں وہ نقطے والے بلینک پر کرتے جو منشی نول کشور پریس نے بہ تقاضا ے تہذیب و تعزیرات ہند خالی چھوڑ دیے تھے، گفتگو میں ہر جملے کے بعد شعر کا ٹھیکا لگاتے، افسانہ نویسی کی مشق و مشقت بھی جاری تھی، نیاز فتح پوری کی اطلسی فقرہ طرازی اور ابوالکلام کی جھومتی جھامتی گج گامنی نثر کی چھاپ، ایک انہی پر موقوف نہیں، اچھے اچھوں کی طرز تحریر پر تھی، بعض پر ماتھے کے جھومر کے مانند، کچھ پر دھوبی کے نشان کی طرح اور کچھ پر اس طرح جیسے انگریز ملاح اپنی محبوباؤں کی تصویریں جسم پر گد والیتے ہیں، جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی، کسی کی محتاجی نہیں، اردو نثر اس زمانے میں فیل پا میں مبتلا تھی، اس میں کچھ افاقہ ہوا تو معجون فلک سی کہا کر ٹیگوری ادب پاروں کے اڑن عالیچے پر سوار ہو گئی، بشارت ایک افسانے کا کلا ٹمکس کچھ اس طرح تھا۔

انجم آرا کی حسن آفرنیوں، سحر انگیزوں، اور حشر سامانیوں سے شام جان معطر تھا، وہ لغزیدہ قدموں سے آگے بڑھیا اور فرط حیا سے اپنی اطلسی بانہوں کو اپنی ہی دزیدہ دزیدہ آنکھوں پ رکھا، سلیم نی انجم آرا کے دست حنائی کو اپنے ہاتھ میں لے کر پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس کی ہیر تراش کلائی اور ساق بلوریں کو دیکھا اور گلنار سے لبوں پر --- چار نقطے ثبت کر دیے، اس زمانے میں لفظ بوسہ فحش سمجھا جاتا تھا، لہذا اس کی جگہ نقطے لگا دیئے جاتے تھے، بشارت گن کر اتنے ہی نقطے لگاتے جب جن کی اجازت اس وقت کے حالات، حیایا ہیروں نے دی ہو، ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں انجمن ترقی اردو کے رسالے میں ایک مضمون چھپا تھا۔ اس میں جہاں جہاں لفظ بوسہ آیا وہاں مولوی عبدالحق نے بر بنائے تہذیب اس کے ہجے یعنی ب س و ہ چھاپ کر الٹا اس کی لذت و طوالت میں اضافہ کر دیا، یہاں ہمیں ان کا یا اپنی حبیب لیب کی طرز نگارش کا مذاق اڑانا مقصود نہیں، ہر زمانے کا اپنا اسلوب اور آہنگ ہوتا ہے، لفظ کبھی انگر کہا کر، کبھی عبا عمامہ، کبھی ڈنر جیکٹ یا فولس کیپ، کبھی پیر میں پائل یا بیڑی پہنے نظر آتے تھے، اور کبھی کوئی مداری اپنی قاموسی ڈگڈگی بجاتا ہے تو لفظوں کے سدھے سدھائے بندر ناچنے لگتے ہیں۔ یہ غریب الدیار عہد، نا آشنائے عصر، بیگانہ خویش، نمک پرودہ ریش، خرابہ حسرت کہ موسوم بہ احمد، مدعو بابی الکلام

۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستی عدم سے اس عدم ہستی میں وارد ہوا اور تہمت حیات سے متہم۔

اب لوگ اس طرح نہیں لکھتے، اس طرح پیدا بھی نہیں ہوتے، اتنی خجالت، طوالت و ذابت تو آج کل سیزیرین پیدائش میں بھی نہیں ہوتی۔



اس کی عزت ہی نہیں، ہاتھ پیر کی بھی خیر نہیں، ایک دفعہ عجلت میں تھے، لکڑی کی قیمت چھوٹتے ہی دس روپے بتادی، دیہاتی گاہک نے پونے دس لگائے اور یہ گالی دیتے ہوئے مارنے کو دوڑے کہ خت گنورا کو اتنی جرات کیسے ہوئی، دکان میں ایک ٹوٹی ہوئی چار پائی پڑی رہتی تھی، جس کے بانوں کو چرا کر آرا کھینچنے والے مزدور چلم میں بھر کے سلفے کے دم لگاتے تھے، قبلہ جب باقاعدہ مسلح ہو کر حملہ کرنا چاہتے تو اسچارپائی کا سیروا یعنی سرہانے کبیٹی نکال کر اپنے دشمن یعنی گاہک پر جھپٹتے، اکثر سیروے کو پچکارتے ہوئے فرماتے عجب سخت جان ہے، آج تک اس میں فریکچر نہیں ہوا، لٹہ رکھنا بزدلوں اور گنواروں کا وتیرہ ہے، اور لاٹھی چلانا، قصائی، کنجڑوں، غنڈوں، اور پولیس کا کام ہے، استعمال کے بعد سیروے کی فرسٹ ایڈ کر کے یعنی انگوچھے سے اچھی طرح جھاڑ پونچھ کر واپس بھانگے میں لگا دیتے، اس طریقہ واردات میں غالباً یہ حکمت عملی پوشیدہ تھی، کہ چار پائی تک جانے اور سیروا نکالنے کے وقفے میں اگر غصے کو ٹھنڈا ہونا ہے تو ہو جائے، اور اگر ان کے معتوب کی بینائی اور عقل زائل نہیں ہوئی ہے تو وہ اپنی ٹانگوں کے استعمال میں مزید بخل سے کام نہ لے، ایک قدیم چینی کہاوٹ ہے کہ لڑائی جو ۳۸۰ پینترے دانائوں نے گنوائے ہیں، ان میں جو پینترا سب سے کارآمد بتایا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ بھاگ لو اس کی تصدیق ہندو یا مالاسے بھی ہوتی ہے، روان کے دس سر اور بیس ہاتھ تھے، پھر بھی مارا گیا، اس کی وجہ ہماری سمجھ میں تو یہی آئی ہے، کہ بھاگنے کے لیے صرف دو ٹانگیں تھیں، حملہ کرنے سے پہلے قبلہ کچھ دیر خویاتے تاکہ مخالف اپنی جان بچانا چاہتا ہوں تو بچالے جائے، فرماتے تھے، آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کسی شخص کی ٹھکانی کرنے سے پہلے میں نے اس گالی دے کر خبردار نہ کیا ہو، کیا شعر ہے وہ بھلا سا؟ ہاں پشہ سے سیکھے شیوہ مردانگی کوئی جب قصد خوں کو آئے تو پہلے پکار دے انسانی کردار میں مچھر کی صفات پیدا کر کے اتنا فخر کرتے ہیں ہم نے انہی کو دیکھا، پروفیسر قاضی عبدالقدوس، ایم اے، بے ٹی نی ان کے خیالات سے متاثر ہو کر اپنے دو بقراطی لیکچروں کے مجموعے بعنوان خطابات چاکسو کی اوٹ لائن بنائی، مشرقی شعر و روایت میں پشہ کا مقام تاریخی تناظر میں معروضی زاویے سے اور موازنہ پشہ و شاہین ہمارے قارئین ماشاء اللہ عاقل ہیں، اشارے کی بھی ضرورت نہیں کہ میدان کس کے ہاتھ رہا۔

ہوں لائق تعزیر، پہ الزام غلط ہے

قبلہ کی ہیبت سب کے دلوں پر بیٹھی تھی، بجز دائیں جانب والے دکان دار کے، وہ قنچ کا رہنے والا، نہایت خود سر، ہتھ چھت، بد معاملہ اور بد زبان آدمی تھا، عمر میں قبلہ سے بیس سال کم ہوگا، یعنی جوان اور سرکش، چند سال پہلے تک اکھاڑے میں باقاعدہ زور کرتا تھا، پہلوان سیٹھ کہلاتا تھا، ایک دن ایسا ہوا

کہ ایک گاہک قبلہ کی سرحد میں ۳/۴ مرتبہ ہو چکا تھا، کہ پہلوان سیٹھ اسے پکٹ کر گھسیٹتا ہو اپنی دکان میں لے گیا اور قبلہ مہاراج مہاراج پکارتے رہے، کچھ دیر بعد وہ اس کی دکان میں گھس کر گاہک کو چھڑا لانے کی کوشش کر رہے تھے، کہ پہلوان سیٹھ نے ان کو وہ گالی دی جو وہ خود سب کو دیا کرتے تھے۔

پھر کیا تھا قبلہ نے اپنے اسلحہ خانہ خاص یعنی چار پائی سے پٹی نکالی اور ننگے پیر دوڑتے ہوئے اس کی دکان میں دوبارہ داخل ہوئے، گاہک نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی اور اولین غفلت میں اپنا دانت تڑوا کر مصالحتی کاروائی سے ریٹائرڈ ہو گیا، دریدہ دہن پہلوان سیٹھ دکان چھوڑ کر بگٹت بھاگا، قبلہ اس کے پھیچے سر پٹ، تھوڑی دور جاکر اس کا پاؤ ریل کی پٹری میں الجھا اور وہ منہ کے بل گرا قبلہ نے جا لیا، پوری طاقت سے ایسا وار کیا کہ پٹی کے دو تکرے ہو گئے، معلوم نہیں اس چوٹ سے آئی ریل کی پٹری پ رگرنے سے، وہ دیر تک بے ہوش پڑا رہا، اس کے گرد خون کی نلیا سی بن گئی۔ پہلوان سیٹھ کی ٹانگ کے ملٹی پل فریکچر میں کنگریں ہو گیا اور ٹانگ کاٹ دی گئی، فوگداری مقدمہ بن گیا، اس نے پولین کو خوب پیسا کھلایا اور پولین نے دیرینہ عدالت کی بنا پر قبلہ کا اقدام قتل میں چالان پیش کر دیا، تعزیرات ہند کی اور بہت سے دفعات بھی لگادیں، لمبی چوڑی فرد جرم سن کر قبلہ فرمانے لگے کہ ٹانگ کا نہیں، تعزیرات ہند کا ملٹی پل فریکچر ہوا ہے، پولیس گرفتار کر کے لے جانے لگی تو بیوی نے پوچھا اب کیا ہوئے گا؟ کندھے اجکاتے ہوئے بولے دیکھیں گے، عدالت مجسٹریٹی میں بیچ بچاؤ کرنے والے کا گاہک کا دانت اور آلہ قتل یعنی چار پائی مع خون پلائی پوئی پٹی کے طور پیش ہوئے، مقدمہ سیشن سپرد ہو گیا، قبلہ کچھ عرصے ریمانڈ پر جوڈیشنل حوالات میں رہے تھے، اب جیل میں باقاعدہ خونیوں، ڈاکوؤں، جیب کتروں اور عادی مجرموں کے ساتھ رہنا پڑا، تین چار مچٹیوں کے بعد وہ بھی قبہ کو اپنا چچا کہنے اور ماننے لگے۔ ان کی طرف سے یعنی بحیثیت وکیل صفائی کانپور کی ایک لائق بیرسٹر مصطفیٰ رضا قریشی نے پیروی کی، مگر وکیل اور موکل کا کسی ایک نکتے پر بھی اتفاق رائے نہ ہوسکا، مثلاً قبلہ بصد تھے کہ حلف اٹھا کر بیان دوں گا مضروب نے اپنی ولدیت غلط لکھوائی ہے، اس صورت اپنے باپ سے نہیں، باپ کی ایک اوباش دوست سے ملتی ہے، بیرسٹر موصوف یہ موقف اختیار کرنا چاہتے تھے، کہ چوٹ ریل کی پٹری پر گرنے سے آئی ہے، نہ کہ ملزم کی مبینہ ضرب سے، ادھر قبلہ کمرہ عدالت میں فلمی بیرسٹروں کی طرح طرح ٹہل ٹہل کر اور کٹھرے کو جنھجھوڑ جنھجھوڑ کر یہ اعلان کرنا چاہتے تھے کہ میں سپاہی بچہ ہو، دکان دار میرے لیے ذریعہ عزت نہیں رہی بلکہ عرصہ دراز سے ذریعہ آمدنی بھی نہیں رہا، ٹانگ پر وار کرنا ہماری شان سپہ گری اور شیوہ مردانگی کی توہین ہے، میں تو دراصل اس کا سر پاش پاش کرنا چاہتا تھا، لہذا اگر مجھے سزا دینی ہی تو ٹانگ توڑنے کی نہیں،

غلط نشانے کی دیجئے ہوں لائق تعزیر ، یہ الزام غلط ہے۔

ایام اسیری اور جوں کا بلڈ ٹیسٹ

عدالت میں فوجداری مقدمہ چل رہا تھا، قرائن کہتے تھے کہ سزا ہو جائے گی اور خاچی لمبی ، گھر میں ہر پیشی کے دن رونا پیٹنا مچتا، اعزاء اور احباب اپنی جگہ پریشان اور سرا سیمہ کہ ذرا سی بات پر یہ نوبت آگئی، پولیس انہیں ہتھکڑی پہنا کر پورے شہر کا چکر دے کر عدالت میں پیش کرتی اور پہلوان سیٹھ سے حق الخدمت وصول کرتی، بھولی بھالی بیوی کو یقین نہیں آتا تھا، ایک ایک سے پوچھتیں بھیا کیا سچ مچ کی ہتھکڑی پہنائی تھی؟ عدالت کے اندر اور باہر قبلہ کے تمام دشمنوں یعنی سارے شہر کا ہجوم ہوتا ، سارے خاندان کی ناک کٹ گئی، مگر قبلہ نے کبھی منہ پر تولیا اور ہتھکڑی پر رومال نہیں ڈالا، گشت کے دوران مونچھوں پر تاؤ دیتے تو ہتھکڑی جھن جھن جھن کرتی، رمضان آیا تو کسی نہ مشورہ دیا کہ نماز روزہ شروع کر دیجئے ، اپنے کان ہی پور کے مولانا حسرت موہانی تو روزے میں چکی بھی پیستے تھے ، قبلہ نے بڑی ہقارت سے جواب دیا لاحول و لاقوتہ میں شاعر تھوڑا ہی ہوں، یہ نام ہوگا غم روزگار سے نہ سکا۔ بیوی نے کئی مرتبہ پچھوایا اب کیا ہوئے گا؟، ہر بار ایک ہی جواب ملا دیکھ لیں گے طیش کے عالم میں جو بات منہ سے نکل جائے یا جو حرکت سرزد ہو جائے ، اس پر انہیں کبھی نادم ہوتے نہیں دیکھا، فرماتے تھے ، کہ آدمی اصل کردار کی جھلک تو طیش کے کوندے میں ہی دکھائی دیتی ہے ، جناح اپنے کسی کرتوت یعنی اصل کردار پر پشیمان یا پریشان ہونے کو مردوں کی شان کے خلاف سمجھتے تھے ، ایک دن ان کا بھتیجا شام کو جیل میں کھانا اور جوئیں مارنے کی دوا دے گیا، دوا کے اشتہار میں لکھا گیا تھا، کہ اس کے ملنے سے جوئیں اندھی ہو جاتیں ہیں، پھر انہیں آسانی سے پکڑ کر مارا جاسکتا ہے ، جوں اور لکیہ مانے کی مروجہ ترکیب بھی درج تھی، یعنی جو کو بائیں ہاتھ سے کے انگھوٹے پر رکھو اور دائیں انگھوٹے کے ناخن سے چٹ سے کچل دو، اگر جوں کے پیٹ سے کال یا گھر اعنابی خون نکلے تو فوراً اکسیر جالینوس مصفی خون پی کر اپنا خون صاف کیجئے ، پرچے میں یہ ہدایت بھی تھی، کہ دوا کو کورس اس وقت جاری رکھا جائے جب تک جوں کے پیٹ سے صاف شدہ خون نہ نکلنے لگے، قبلہ نے جنگلے کی طرف اشارے سے بھتیجے کو کہا کہ اپنا کان میرے منہ کے قریب لاؤ، پھر اس سے کہا کہ برخور دار زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، دنیا اس جیل سمیت، سرائے فانی ہے ، غور سے سنو، یہ میرا حکم بھی ہے ، اور وصیت بھی، لوہے کی الماری میں دو ہزار روپے آڑے وقت کے لیے ردي کے اخباروؤ کے نیچے چھپا آیا تھا، یہ رقم نکال کر الن شہر کا نامی غنڈھ کو دے دینا، اپنی چچی کو میری طرف سے دلاسا دینا، الن کو میری دعا کہنا اور یہ کہنا کہ ان چہوں کی ایسی ٹھکانی کرے کے گھر والے صورت نہ پہچان سکیں، یہ کہ کر اخبار کا ایک ملس ہوا پرزہ

بتھيجے ڪو تهما ديا، جس ڪے شيعے ڀر ان چھ گواهان استغاثه ڪے نام درج تهے جن ڪو پٽوانے ڪا انھون نے جيل ميں اس وقت منصوبه بنايا تھا، جب ايسي حرڪت ڀر انھين آج ڪل ميں سزا هونے والي تهئي۔  
 ايڪ دفعه اتوار ڪو ان ڪا بهتيجا جيل ميں ملاقات ڪيائے آيا اور بولا ڪه جيلر تڪ باساني وفارش ڀهنچائي جاسڪتي هے ، اگر آپ ڪا جي ڪسي خاص ڪهانهے مثلا زردھيا دھي بڙے ، شوق ڪي مثنوي، سگريٽ يا مهوے ڪے پان ڪو چاهے تو چوري چھپے هفتے ميں ايڪ بار آساني سے ڀهنچايا جاسڪتا هے، چچي نے تاڪيد سے ڪها هے، عيد نزديڪ آرهي هے رورو ڪر آنڪھين سجالي هيں۔

### ايام اسيري اور جون ڪا بلڊ ٿيسٽ

قبله نے جيل ڪے ڪهدر ڪے نيڪر ڀر دوڙتا هوا ڪهٽمل پڪڙتے هوائے ڪها مجھے قطعي طور ڪسي چيز ڪي حاجت نهين، اگلي دفعه او تو سراج فوٽو گرافر سے حويلي ڪا فوٽو ڪهنچوا ڪر لانا ڪئيمهينے هونگے ديكھے هوائے، جدھر تمهاري چچي ڪے ڪمرے ڪي چق هے ، اس رخ سے ڪهينچتو اچهي لگے ڪي سنرتي نے زمين ڀر زور سے بوٽ ڪي تهاپ لگاتے اور تهر ناٽ تھري ڪي رائفل ڪا ڪندھ بجاتے هوائے ٿڀٽ ڪر ڪها ملاقات ڪا وقت ختم هونگيا، عيد ڪا خيال ڪر ڪے بتھيجے ڪي آنڪھين ڏبڏبا آئين اور اس نے نظرين نيچي ڪرلين، اس ڪے هونٽ ڪانڀ رھے تهے، قبله نے اس ڪا ڪان پڪڙا اور ڪهينچ ڪر اپنے منھ تڪ لانے ڪے بعد ڪها، هاں هوسڪے تو جلد ايڪ تيز چاقوڪم از ڪم چھ انچ ڪے پهل والا، ڏبل روٽي يا عيد ڪي سويون ميں چھپا ڪر بهجوادو، دوم، بمبي ميں پينٽينگولر شروع هونے والا هے ، ڪسے ترڪيب سے مجھے روزانه اسڪور معلوم هو جائے تو والله هر روز عيد هو، هر شب شب برات، خصوصاً وزير علي ڪا اسڪور دن ڪے دن معلوم هو جائے تو ڪيا ڪهنا۔

سزا هونگي، ڏيڙھ سال قيد بامشقت، فيصله سنا، سرائها ڪر اوڀر ديكھا، گويا آسمان سے پوچھ رھے هون تو ديكھ رها هے، ڪيا هو رها هے، پوليس ني ڀتهڪڙي ڏالي، قبله نے ڪسي قسم ڪے رد عمل ڪا اظهار نهين ڪيا، جيل جاتے وقت بيوي ڪو ڪهلا بهيجا ڪه آج ميرے جد اعليٰ ڪي روح ڀر فتوح ڪتتي مسرور هونگي، ڪتتي خوش نصيب بي بي هوتم ڪه تمهارا دولها جي هاں هي الفاظ استعمال ڪيا تھا، ايڪ حرامزادے ڪي ٿهڪائي ڪر ڪے مردون ڪا زيور ڀهنے جيل، جارها هے، لڪڙي ڪي ٿانگ لگوا ڪر گهر نهين آرها، دو رڪعت نماز شڪرانے ڪي پڙهنا ، بهتيجے ڪو تاڪيد ڪي ڪه حويلي ڪي مرمت ڪراتے رهنا، اپني چچي ڪا خيال رڪهنا، ان سے ڪهنا يه دن بهي گزر جائين گے، دل بهاري نه ڪرين اور جمعے ڪو ڪانسي دوپٽا اور ٿهنا ڪه چھوڙين بيوي نے ڀهچوايا اب ڪيا هوائے گا؟، جواب ملا ديكھا جائے گا۔

ٿارزن ڪي واپسي

دو سال تک دکان میں تالا پڑا رہا، لوگوں کا خیال تھا، جیل سے چھوٹنے کے بعد چپ چپاتے کہیں اور چلے جائیں گے، قبلہ جیل سے چھوٹے، ذرا جو بدلے ہوں، ان کی ریڑھ کی ہڈی میں جو جوڑ نہیں تھے جاپانی زبان میں کہاوت ہے کہ بندر درخت سے زمین پر گر پڑے، پھر نہی بند ہی رہتا ہے، سو وہ بھی ٹارزن کی طرح چپختے ہوئے جیل سے نکل کر سیدھے اپنے آبائی قبستان گئے، والد کی قبر کی پاک پائینتی کی خاک سر پر ڈالی، فاتحہ پڑھی اور کچھ سوچ کر مسکرا دیے۔

دوسرے دن دکان کھولی، کین کے باہر ایک بلی گاڑ کر اس پر ایک لکڑی کی ٹانگ بڑھئی سے بنا کر لٹکادی، صبح و شام اس کو سی سے کھینچ کر طرح چڑھاتے اور اتارتے تھے، جس طرح اس زمانے میں چھاؤنیوں میں یونین جیک چڑھایا اتار جاتا تھا، جن نادہندوں نے دو سال سے رقم دبا کر رکھی تھی، انہیں یاد دہانی کے دھمکی آمیز خطوط لکھے، اور اپنے نام کے دستخط کے ساتھ بریکٹ میں سزا یافتہ لکھا، جیل جانی سے پہلے خطوط میں خود کو بڑے فخر سے ننگ اسلاف لکھا کرتے تھے، کس کی مجال ن تھی، کس اس سے اتفاق کرے، اتفاق کرے، تو درکنا، مارے ڈر کے اختلاف بھی نہیں کر سکتا تھا، اب اپنے نام کے ساتھ ننگ اسلاف کے بجائے، سزا یافتہ اس طرح لکھنے لگے جیسے لوگ ڈگریاں یا خطاب لکھتے ہیں، قانون اور جیل سے ان کی جھجھک نکل چکی تھی۔

### لب معشوق

اب کے دکانچلی اور ایسی چلی کہ خود انہیں بھی حیرت ہوئی، دکان کے باہر اسی شکار گاہ یعنی کین میں اسی ٹھسے سے گاؤں تکیے کی ٹیک لگا کر بیٹھتے، مگر زوایہ پسر گیا تھا، پیروں کا رخ اب فرش کی بہ نسبت آسمان کی طرف تھا، جیل میں سکونت پزیر ہونے سے پہلے قبلہ گاہک کو ہاتھ کے ملتجیانہ اشارے سے طلب کرتے تھے، اب صرف انگشت شہادت کے خفیف سے اشارے سے طلب کرنے لگے، انگلی کو اس طرح حرکت دیتے جیسے ڈانواں ڈول پتنگ کو ٹھمکی دے کر اس کا قبلہ دسرت کرھے ہو، حقے کی نسیے میں اب ایک فٹ کا اضافہ کر لیا، حقہ اب پیتے کم، گڑ گڑاتے زیادہ تھے، بدبودار دھوینک کا چھالاوا اس طرح چھوڑتے کہ گاہک کی ناک میں نتہ کی طرح لٹک جائے، اکثر فرماتے واجد علی شاہ، جان عالم پیانے، جو خوب صورت نام رکھنے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے، حقے کا کیسا پیارا نام رکھا تھا، لب معشوق، جو شخص کبھی حقہ کے پاس سے بھی گزرا ہے وہ بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ جان عالم پیا کا پالا کیے لبوں سے پڑا ہوگا، چنانچہ معزولی کے بعد وہ فقط حقہ اپنے ہمراہ مٹیا برج لے گئے، پری خانے کے تمام معشوق لکھنؤ میں ہی چھوڑ گئے، اس لیے کہ معشوق کو نیچہ پکڑ کے گڑ گڑایا نہیں جاسکتا۔

بلی پہ لٹکا دوں گا

منشي ديا نرائن نغم کے رسالے زمانہ کے کاتب سے عرفی کا مشہور شعر احاطے کی دیوار پر ڈامر سی لکھو ادیا؛ عرفی تو میندش زوغائے رقیباں آواز سگاں کم نہ کندر رزق گدا راہمیں اس شعر سے نسلی عصبیت اور جانب دار کی بو آتی ہے، کٹے اگر شعر کہہ سکتے تو دوسرا مصرع کچھ یوں ہوتا؛ من یعنی پہلوان سیٹھ دکان بڑھا کر کہیں اور چلا گیا، قبلہ بات بے بات ہر ایک کو دھمکی دینے لگے، کہ سالے کو اٹھا کر بلی پر ٹانگ دوں گا، ہیبت کا یہ عالم کہ اشارہ تو بہت دور کی بات ہے، قبلہ جس گاہک کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ لیں، اسے کوئی آواز بھی نہیں دیتا تھا، اگر وہ از خود کسی دوسری دکان میں چلا جاتا تو دکان دار اسے لکڑی نہیں دکھاتا تھا، ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ سڑک پر یوں ہی کوئی راہ گیر منہ اٹھائے جا رہا تھا کہ قبلہ نے اسے انگلی سے اندر آنے کا اشارہ کیا، جس دکان کے سامنے سے وہ گزر رہا تھا اس کا مالک اور منیم گھسٹتے ہوئے قبلہ کی دکان میں دکھیل دیا، اس نے قبلہ سے روہانسا ہو کر کہا میں تو مول گنج کیپتنگوں کے پیچ دیکھنے جا رہا تھا۔

وہ انتظار تھا جس یہ وہ شجر تو نہیں

پھر یکا یک ان کا کاروبار ٹھپ ہو گیا، وہ کڑ مسلم لیگی تھے، اس کا اثر ان کی بزنس پر پڑا، پھر پاکستان بن گیا، انہوں نے اپنے نعرے کو حقیقت بنتے دیکھا ہے، اور دونوں کی پوری قیمت ادا کی، گاہکوں نے آنکھیں پھر لیں، لکڑ منڈی کے چوہے شیر ہو گئے، عزیز و اقارب جن سے وہ تمام عمر لڑتے جھگڑتے اور نفرت کرتے رہے، ایک ایک کر کے پاکستان چلے گئے، تو ایک چھٹکے کے ساتھ یہ انکشاف ہوا کہ وہ ان نفرتوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے اور جب اکلوتی بیٹی اور داماد بھی اپنی دکان بیچ کر کراچی سدھارے تو انہوں نے بھی اپنے خیمے کی طنا بین کاٹ لیں، دکان اونے پونے ایک دلال کے ہاتھ بیچی، لوگوں کا کہنا تھا بے نامی سودا ہے، دلال کی آڑ میں دکان دراصل اس ہی لنگڑے سیٹھ نے خرید کر ان کی ناک کاٹی ہے، خفیف سا شبہ تو قبلہ کو بھی ہوا تھا، مگر اپنی بیلا سے بوم بسی یا ہمار ہے، والی صورت حال تھی، ایک ہی جھٹکے میں پیڑھوں کے رشتے ناتے ٹوٹ گئے اور قبلہ نے پرکھوں کی جنم بہوم چھوڑ کر ان کے خوابوں کی سر زمین کا رخ کیا۔

ساری عمر شیش محل میں اپنی مور پنکھ انا کا ناچ دیکھتے دیکھتے، قبلہ ہجرت کر کے کراچی آئے تو نہ صرف زمین اجنبی لگی، بلکہ اپنے پیروں پر نظر پڑی تو وہ بھی کسی اور کے لگے، کھولنے کی تو لی مارکیٹ میں ہر چند رائے روڈ پر لشتم پشتم دکان کھول لی، مگر بات نہیں بنی، گجراتی میں مثل ہے کہ پر نے مٹکے پر نیا منہ نہیں چڑھایا جاسکتا، آنے کو تو وہ ایک نئی سرسبز زمین میں آگئے، مگر ان کی بوڑھی آنکھیں پلکھن کو ڈھونڈھتی رہیں، پلکھن تو درکنا، انہیں تو کراچی میں نیم تک نظر نہ آیا، لوگ جیسے نیم بتاتے تھے، وہ دراصل بکائی تھی، جس کی بنولی کو لکھنؤ میں حکیم صاحب عالم چیچیش اور بواسیر

کے نسخوں میں لکھا کرتے تھے۔ وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ شجر تو نہیں، کہاں کانپور کے دیہاتی گاہک، کہا کراچی کے نخریل سا گو ان خریدنے والے، در حقیقت انہیں جس بات سے سب سے زیادہ تکلیف ہوئی وہ یہ تھی، کہ یہاں اپنے قرب و جوار میں، یعنی اپنے سایہ زحمت میں ایک شخص بھی ایسے نظر نہیں آیا جسے وہ بے خنر و بے وجہ گالی دے سکیں، ایک دن کہنے لگے، یہاں تو بڑھئی آری کا کام زبان سے لیتا ہے، چار پانچ دن ہوئے ایک دریدہ دہن بڑھئی آئے، اقبال مسیح نام تھا، میں نے کہا، ابے پرے ہٹ کر کھڑا ہو، کہنے لگا، حضرت عیسیٰ بھی تو رکھان تھے، میں کہا کیا کفر بکتا ہے؟ ابھی بلی پر لٹکادوں گا، کہنے لگا او لوک وی ایہی کہندے ساں وہ لوگ بھی حضرت عیسیٰ سے یہی کہتے تھے۔

میر تقی میر کراچی میں

پہلی نظر میں انہوں نے کراچی کو اور کراچی نے ان کو مسترد کر دیا تھا، اٹھتے بیٹھتے کراچی میں کیڑے ڈالتے، شکایت کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا۔ خست یہ مچھر ہے یا مگر مچہ؟ کراچی کا مچھر ڈیڈی ٹی سے بھی نہیں مرتا، صرف قوالوں کی تالیوں سے مرتا ہے، یا غلطی سے کسی شاعر کو کاٹ لے تو باؤلا ہو کر بے اولاد مرتا ہے، نمرود مردوں کی موت ناک میں سے مچھر گھسنے سے واقع ہوئی تھی، کراچی کے مچھروں کا شجرہ نسب کئی نمرودوں کے واسطے سے اسی مچھر سے جا ملتا ہے، اور ذرا زبان تو ملاحظہ فرمائیں میں نے پہلی بار ایک صاحب کو پٹے والے پکارتے سنا تو میں سمجھا اپنے کتے کو بلا رہے ہیں، معلوم ہوا یہاں چپراسی کو پٹے والا کہتے ہیں، ہر وقت کچھ نہ کچھ پھٹا اور لفظ ہوتا رہتا ہے، ٹوکو تو کہتے ہیں، اردو میں اس صورت حال کیلئے کوئی لفظ نہیں ہے، بھائی میرے اردو میں یہ صورت حال بھی تو نہیں ہے، بمبئی والے لفظ اور صورت حال دونوں اپنے ساتھ لائے تھے، میر تقی میر اونٹ گاڑی میں منہ باندھے بیٹھے رہے، اپنے ہم سفر سے اس لیے بات نہ کی کہ زبان غیر سی اپنی زبان بگڑتی ہے، میر صاحب کراچی میں ہوتے تو بخدا ساری عمر منہ پر ڈھانا باندھے پھرتے، یہاں تک کہ ڈاکوؤں کا سا بھیس بنائے پھر نے پر کسی ڈکیتی میں دھر لیے جاتے، اماں ٹونک والوں کو امرود کو صفری کہتے تو ہم نے بھی سنا تھا، یہاں مروود کو جام کہتے ہیں اور اس پر نمک مرچ کے بجائے صاحب لگا دیں مراد نواب صاحب لسبیلہ ہوتے ہیں، اپنی طرف وکٹوریہ کا مطلب ملکہ ٹوریا ہوتی تھا، یہاں کسی ترکیب سے دس بارہ جنے ایک گھوڑے پر سوری گانٹھ لیں تو اسے وکٹوریہ کہتے ہیں، میں دو دن لاہور رکا تھا، وہاں دیکھا جس بازار میں کونلوں سے منہ کالا کیا جاتا ہے، وہ ہیرا منڈی کہلاتی ہے، اب یہاں نیا فیشن چل پڑا ہے، گانے والے کو گلوکار اور لکھنے والے کو قلم کار کہنے لگے ہیں، میاں ہمارے وقتوں میں صرف نیکو کا اور بدکار ہوا کرتے تھے، قلم اور

گلے سے یہ کام نہیں لیا جاتا تھا۔

میر تقی میر کراچی میں

میں نے لالو کھیت ، بہار کالونی ، چاقی واڑہ اور گولیمار کا چہ چہ دیکھا ہے ، چودھ پندرہ لاکھ آدمی اخبار والے اب آدمی کہنے سے شرماتے ہیں، افراد اور نفوس کہتے ہیں، ضرور رہتے ہوں گے ، لیکن کہیں کتابوں اور عطریات کی دکان نہ دیکھی، کاغذ تک کے پھول نظر نہ آئے ، کانپور میں ہم جیسے شرفا کے گھروں میں کہیں نہ کہیں موتیا کی بیل ضرور چڑھی ہوتی تھی، خضور والا یہاں موتیا صرف آنکھوں میں اترتا ہے حد ہوگئی، کراچی میں لکھ پتی، کڑوڑ پتی سیٹھ لکڑی اس طرح نیواتا ہے ، گویا کم خواب کا پارچہ خرید رہا ہے ، لکڑی دن میں دو فٹ بکتی ہے اور برادھ خریدنے والے پچاس میں نے برسوں ایلوں پر پکایا ہوا کھانا بھی کھایا ہے ، لیکن برادے کی انگھیٹی پر جو کھانا پکے گا وہ صرف دو ذخمی مردوں کے چالیسویں کے لیے مناسب ہے۔

بھر پائے ایسی بزنس سے ، مانا کہ روپیہ بہت کچھ ہوتا ہے ، مگر سبھی کچھ تو نہیں، زرکو حاجت دوا کرنے والا، قاضی الحاجات کہا گیا ہے ، تسلیم، مگر جب یہ خود سب سے بڑی حاجت بن جائے تو وہ صرف موت سے رفع ہوگی، میں نے تو اسے زندگی میں ایسی کافی کھتری لکڑی نہیں بچی، نہ فروختی، نہ سوختی، بڑھئی کی یہ مجال چہاتی پہ چڑھ کر کمیشن مانگے ، نہ دو تو مال کو گندے انڈے کی طرح قیامت تک سیتے رہوں، ہائے نہ ہوا کانپور بسولے سے سالے کی ناک اتار کر ہتھلی پر رکھ دیتا کہ جا اپنی جروا کو دین مہر میں دے دینا، واللہ، یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے ، سنتا ہوں یہاں کے بازار حسن نیپیر روڈ اور جاپانی روڈ پر شب زادیاں اپنے اپنے درشن دریچوں میں لال بتیاں جلتے ہی خنجراب چہاتیوں کے خوانچے لگا کر بیٹھ جاتی ہیں، فلموں میں بھی اشرف المعلاقات ہی کی نمائش ہوتی ہے ، بہتو وہ ہی مثل ہے کہ اوچھے کے گھر تیتیر، باہر باندھوں کے بھیتر، جمہوریہ اسلامیہ کی سرکار نے سروکار کچھ نہیں کر سکتی ، لیکن کسی طوائف کو شادی بیاہ میں مجرے کیلے بلانا ہو تو پہلے اسکی اطلاع تھانہ متعلقہ کو دینی پڑتی ہے ، رنڈی کو مرمت راشن کارڈ پہ ملتے ہم نے بیہن دیکھا، نقد عیش عندلطلب نہ ملاتو کس کام کا، درشنی منڈیوں کا کیا کام مرزا عبد الودود بیگ اس صورت حال کی کچھ اور ہی تاویل کرتے تھے ، فرماتے ہیں کہ طوائف کو تھانے سے این او سی اس لیے لینا پڑتا ہے کہ پولیس پوری طرح اطمینان کرلے کہ وہ اپنے دھندے پر ہی جا رہی ہے ، وعظسننے یا سیاست میں حصہ لینے نہیں جا رہی ہے۔ ایک دن قبلہ فرمانے لگے ابھی کچھ دن ہوئے کراچی کی ایک نامی گرامی طوائف کا گانا سننے کا اتفاق ہو، اماں اس کا تلفظ ت وچال چلن سے بھی زیادہ خراب نکلا، ہائے ایک زمانہ تھا، کہ شرفا اپنے بچوں کو ادب آداب سیکھنے کے لیے چوک

کی طوائفوں کے کوٹھے پر بھیجتے تھے۔ اس باب میں بھی مرزا سوظن سے کام لیتے ہیں، فرماتے ہیں کہ طوائفوں کے کوٹھوں پر تو اس لیے بھیجتے تھے، کہ بزرگوں کی صحبت اور گھر کے مابول سے بچے رہے۔

دوڑتا ہوا درخت

کراچی شہر انہیں کسی طور پر اور کسی طرف سے اچھا نہیں لگا، جھنلا کر بار بار کہتے اماں یہ شہر ہے یا جہنم؟ مرزا کسی دانا کے قول میں تصرف بہ جا کر کے فرماتے ہیں، کہ قبلہ اس دار الحمن سے کوچ فرمانے کے بعد اگر خدانہ خواستہ وہیں پہنچ گئے جس سے کراچی کو تشبیہ دیا کرتے تھے، تو چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد یہی ارشاد ہوگا، کہ ہم نے تو سوچا تھا، کراچی چھوٹا سا جہنم ہے، جہنم تو بڑا سا کراچی نکلا۔ ایک دفعہ ان کے ایک بے تکلف دوست نے ان سے کہا کہ تمہیں معاشرے میں خرابیاں ہی خرابیاں نظر آتی ہے، تو ان پر بیٹھے بیٹھے ان پر کڑھنے کے بجائے ان کی اصلاح کی فکر کرو۔ ارشاد فرمایا، سنو میں نے ایک زمانے میں پی ڈبلیو ڈی کے کام بھی کیسے ہیں مگر دوزخ کی ایئر کنڈیشننگ کا ٹھیکا نہیں لے سکتا۔ بات صرف اتنی تھی کہ اپنی چھاپ، تلک اور چھپ چھپوانے سے پہلے وہ جس آئینہ میں خود کو دیکھ دیکھ کر ساری عمر اتریا کیے، اس میں جب نئی دنیا اور نئے وطن کو دیکھا تو وہ امتداد زمانہ سے ڈسٹورٹنگ میرر بن چکا تھا، جس میں ہر شکل اپنا ہی منہ چڑاتی نظر آتی تھی۔

ان کے کاروباری حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے، بزنس نہ ہونے کے برابر تھی، ان کی دکان کی دیوار پر ایک تازہ و صلی اویزاں دیکھ کر ہمیں بڑا دکھ ہوا۔ نہ پوچھ حال مرا، چوب خشک صحرا ہوں لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا ہم نے ان کا دل بڑھانے کیلئے کہا کہ، آپ کو چوب خشک کون کہہ سکتا ہے؟ آپ کی جواں ہمتی اور مستعدی پر ہمیں تو رشک آتا ہے، خلاف معمول مسکرائے، جسے ڈینچرز ٹوٹے، منہ پہ رومال رکھ کر ہنسنے لگے تھے، کہنے لگے، ہاں میاں آپ جواں آدمی ہیں، اپنا تو یہ احوال ہے کہ منفعیل ہو گئے قوی غالب اب عناصر میں ابتدال کہاں پھر منہ سے رومال ہٹاتے ہوئے کہا برخور دار، میں وہ درخت ہو جو ٹرین میں جاتے ہوئے مسافروں کو دوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔

میرے ہی من کا مجہ پر دھاوا

یوں وہ حتی الامکان اپنے غصے کو کم نہیں ہونے دیتے تھے، کہتے تھے میں ایسی جگہ ایک منٹ نہیں رہنا چاہتا جہاں آدمیکسی پر غصہ ہی نہ ہو سکے اور جب انہیں ایسی ہی جگہ رہا پڑا تو وہ زندگی میں پہلی بار اپنے آپ سے روٹھے، اب وہ آپ ہی کڑھتے، اندر ہی اندر کھولتے، جلتے، سلگتے، میرے ہی من کا مجہ پر دھاوا، میں ہی اگنی میں ہی ایندھن، انہی کا قول ہے کہ

یاد کھو، غصہ جتنا کم ہوگا، اس کی جگہ اداسی لیتی چلی جائے گی، اور یہ بڑی بزدلی کی بات ہے، بزدلی کے ایسے ہی ادس لمحوں میں اپنی پناہیں تراش لیں، گویا البم کھل گیا تو دھند لاتے سپیارینگ کی تصویریں چشم تصور کے سامنے بکھرتی چلی جاتیں، ہر تصویر کے ساتھ زمانے کا ورق الٹے چلا گیا، ہر اسنیپ شاٹ کی اپنی ایک کہانی تھی، دھوپ میں ابرق کے ذروں سے جلتی کچی سڑک پر گھوڑوں کے پسینے کی نرمہکار، بھیڑ کے نوزائیدہ بچے کو گلے میں مفلر کی طرح ڈالے شام کو خوش خوش لوٹتے کسان، چلمنوں کے پھیچے ہار سنگھار کے پھولوں سے رنگے ہوئے دوپٹے، ارہر کے ہرے بھرے کھیت میں پگڈنڈی کی مانگ، خشک سالی میں ساون کے تھوٹھے، بادلوں کو رہ رہ کر تکتی نراس آنکھیں، جاڑے کی اجاڑ راتوں میں ٹھٹھرتے گیدڑوں کی منحوس آوازیں، چراغ جلے باڑے میں لوٹتی گایوں کے گلے میں بجتی ہوئی گھنٹیاں، کالی بھنورات میں چوپال کی جلتی بجھتی گشتی چلم پر طویل سے طویل تر ہوتے ہوئے کش، موتیا کے کجروں کی لیٹ کے ساتھ کنوارے پنڈے کی بگولا مہکار، ڈوبتے سورج کی زرد روشنی میں تازہ قبر پر جلتی اگر بتی کا بل کھاتا ہوا دھواں، دہکتی بالو میں تڑختے چنوں کی سوندھی لیٹ سے پھڑکتے ہوئے نتھنے، میونسپلٹی کی مٹیکے تیل کی لالٹین کا بھیکا یہ تھی ان کے گائوں کے ست سکند، یہ ان کے اپنے نافہ مائی کی مہکار تھی، جو یاروں کے دشت میں دوانی پھرتی تھی۔

اولتی کی ٹپاٹپ

ستر سالہ بچے کے ذہن میں تصویریں گڈمڈ وھنے لگتیں، خوشبوئیں، نرمہٹیں اور آوازیں بھی تصویر بن بن کر ابھرتیں، اسے اپنے گائوں میں مینہ برنسے کی ایک ایک آواز الگ سنائی دیتی، ٹین کی چھت پر تڑ تڑ بجتے ہوئے تاشے، سوکھے پتوں پر کراری بوندوں کو شور، پکے فرش پر جہاں انگل بھر پانی کھڑا ہو جاتا وہاں، موٹی بوند گرتی تو ایک موتیوں کا تاج سا ہوا میں اچھل پڑتا، تپتی کھپریلوں پر اڑتی بدلی کے جھالے کی سنسنا ہٹ، گرمی دانوں سے اوپڑے بالک بدن پر برکھا کی پہلی پھوار، جیسے کسی نے منتھول میں نہلادیا، جو ان بیٹے کی قبر پر پہلی بارش اور ماں کاننگھے سرانگن میں آ کر آسمان کی طرف دیھکنا، پھبک اٹھنے کے لیے تیار مٹی پر ٹوٹ کے برسنے والے بادلوں کی ہرادل گرم لیٹ، ڈھولک پر ساوان کے گیتش کی تال پر بجتی چوڑیاں اور بے تال قہقہے سوکھے تلاب کے سرسراتے ریلے، تھونی سے لٹکی ہوئی مٹی دراڑوں کو لواڑتی جال میں ترسا ترسا کر برسنے والی بارشوں کے ہمک کر پرائے آنگن میں گرتے پر نالے، آموں کے پتوں پر مجیرے بجاتی نرسل بوچھار اور جھولوں پر پینگیں لیتی دوشیزائیں۔

اور پھر رات کے سنائے میں پانی تھمنے کے بعد سوتے جاگتے میں اولتی کی ٹپاٹپ اولتی کی ٹپاٹپ تک پیھنچتے پیھنچتے قبلہ کی آنکھیں جل تھل ہو جاتیں،

بارش تو ہم انہیں اپنے لاہور اور ننہیا گلی کی ایسی دکھاسکتے تھے کہ عمر رفتہ کی ساری ٹپاٹ بھول جاتے، پر اولتی کہاں سے لاتے؟ اسے طرح آم تو ہم ملتان کا ایک سے ایک پیش کر سکتے تھے، دسہری، لنگڑا، ثمر بہشت، انور رتول، لیکن ہمارے پنجاب میں تو ایسے درخت ناپید ہیں جن میں آموں کے بجائے دوشیزائیں لٹکی ہوئی ہوں، چنانچہ ایسے نازک موقعوں پر ہم خاموش، ہمہ تن گوش، بلکہ خرگوش بنے اولتی کی ٹپاٹپ سنتے رہتے۔

قبلہ کا ریڈیو اونچا سنتا تھا

دریا کے بہاؤ کے خلاف تیرنے میں تو خیر کوئی نقصان نہیں، ہمارا مطلب ہے کہ دریا کا نقجان نہیں، لیکن قبلہ کو تو سیکڑوں فٹ کی بلندی سے گرتے ہوئے آبشار نیا گرا پر تیر کر چڑھنا چاہتے تھے، یاہوں کہیے کہ تمام عمر نیچے والی ایس کے لیٹر سے اوپر چڑھنے کی کوشش کرتے رہے، اور ایس کے لیٹر بنانے والے کو گالیاں دیتے رہے، ایک دن کہنے لگے مشتاق میاں یہ تمہارا کراچی بھی عجب مردم شناس شہر ہے۔ نہ خریداری کی تمیز، نہ خودراری کے آداب، نہ کسی کی بزرگی کا لحاظ ملاحظہ، میں جس زمانے میں بشارت میاں کے ساتھ بہار کالونی میں رہتا تھا، ایک بیٹری سے چلنے والا ریڈیو خرید لیا تھا، اس زمانے میں ریڈیو میں کار کی بیٹری لگوانی پڑتی تھی، بہار کالونی میں بجلی نہیں تھی، اس کا رکھنا اور چلانا ایک درد سر تھا، بشارت میاں روزانہ بیٹری اپنی کارخانے میں لے جاتے اور چارج ہونے کیلئے آرامشین لگادیتے، ساتھ آٹھ گھنٹے میں اتنی چارج ہو جاتی تھی کہ بس ایک آدھا گھنٹا بی بی سی سن لیتا، اس کے بعد ریڈیو سے آرا مشین کی آوازیں آنا شروع ہو جاتیں اور میں اٹھ کر چلا جاتا، گھر کے پچھوڑے ایک چپیچ گٹ اونچی نہایت قیمتی، بے گانٹھ بلی گاڑ کر ایریل لگارکھا تھا، اس کے باوجود ریڈیو اونچا سنتا تھا، اُسے دن پتنگ اڑانے والے لونڈے میرے ایریل سے پیچ لڑاتے، مطلب یہ کہ اس میں پتنگ الجھا کر زور آزمائی کرتے، ڈور ٹوٹ جاتی، ایریل خراب ہو جاتا، ارے صاحب ایریل کیا تھا، پتنگوں کا فضائی قبرستان تھا، اسپ ریہ کئی پتنگیں چوبیس گھنٹے اس طرح پھڑ پھڑاتی رہتیں، جیسے سڑک کے کنارے کسی نوفویدھ پیر کے مزار پر جھنڈیاں، پچیس فٹ کی اونچائی پر چڑھ کر ایریل دوبارہ لگانا، نہ پوچھئیے کیسا عذاب تھا، بس یوں ہی سمجھئیے سولی پہ لٹک کے بی بی سی سنتا تھا، بہر حال جب برنس روڈ کے فلیٹ میں منتقل ہونے لگا تو سوچا، وہاں تو بجلی ہے چلو ریڈیو بیچتے چلیں، بشارت میاں بھی عاجز آگئے تھے، کہتے تھے، اس سے تو پتنگوں کی پھڑ پھڑا ہٹ براڈ کاسٹ ہوتی ہے، ایک دور کے پڑوسی سے ۲۵۰ روپے میں سودا پکا ہو گیا، علی الصبح وہ نقد رقم لے آیا، اور میں نے ریڈیو اس کے حوالے کر دیا، رات کو گیارہ بجے پھاٹک بند کرنے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں وہ شخص اور اس کے بیل جسی گردن والے دو بیٹے کدال پھاوڑا لیے مزے سے ایریل کی بلی کو اکھاڑ رہے ہیں، میں ڈپٹ کر

پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے؟ سینہ زوری دیکھوں کہتے ہیں، بڑے میاں بلی اکھاڑ رہے ہیں، ہماری ہے ڈھائی سو روپے میں ریڈیو بیچا ہے بلی سے کیا تعلق تعلق نہیں تو ہمارے ساتھ چلو اور ذرا بلی کے بغیر بجا کے دکھاؤ یہ تو اس کی ایسٹری ہے نہ ہوا کانپور سالے کی زبان گدی سے کھینچ لیتا اور ان حرامی پلوں کی بیل جیسی گردن ایک ہی وار میں بھٹا سی اڑا دیتا، میں نے تو زندگی میں ایسا بد معاملہ، بے ایمان آدمی نہیں دیکھا، اسی اثنا میں وہ نابکار بلی اکھاڑ کے زمین پر لٹال چکا تھا، ایک دفعہ جی میں تو آیا کہ اندر جا کر ۱۲ بور لے آؤں اور اسے بھی بلی کے برابر میں لٹال دوں پھر خیال آیا کہ بندوق کا لائسنس تو ختم ہو چکا ہے، اور کمینے کے منہ کی لگنا، اس کی بے قصور بیوی رانڈ ہو جائے گی، وہ زیادہ قانون چھانٹنے لگا تو میں کہا، جا جا تو کیا سمجھتا ہے؟ بلی کی حقیقت کیا ہے، یہ دیکھ یہ چھوڑ کے آئے ہیں۔ قبلہ حویلی کی تصویر دکھاتے ہی رہ گئے اور وہ تینوں بلی اٹھا کر لے گئے۔

### معذور بیوی اور گشتی چلم

ان کی زندگی کا ایک پہلو ایسا بھی تھا، جس کا کسی نے انکو شراتہ ذکر کرتے نہیں سنا تھا، ہم اس کی طرف ابتدائی حصے میں اشارہ کرچکے ہیں، ان کی شادی بڑے چاؤ چونٹلے سے ہوئی تھی، بیوی بہت خوب صورت، نیک طینت اور سلیقہ شعار خاتون تھیں، شادی کے چند سال بعد ایک مرض لاحق ہوا کہ پہنچوں تک دونوں ہاتھوں سے معذور ہو گئیں، قریبی اعزہ بھی ملنے سے گریز کرنے لگے، روز مرہ کی ملاقاتیں، شادی غمی میں شرکت، سبھی سلسلے رفتہ رفتہ منقطع ہو گئے، گھر کا سارا کام نوکر اور مامائیں تو نہیں کرسکتی تھیں، قبلہ جس سے محبت اور دل سوزی سے تمام عمر بے عذر خدمت اور دیکھ ریکہ کی، اس کی مثال مشکل سے ملے گی، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کی چوٹی بے گندھی اور دوپٹہ بے چنا ہو، یا جمعے کو کاسنی رنگ کا نہ ہو، وقت نے سر پر کانسی دوپٹے کے نیچے روئی کے گالے جمادیے، مگر ان کی توجہ اور پیار میں جو ذرا فرق آیا ہوں، یقین نہیں آتا تھا، کہ ایثار و رفاقت کا یہ وہ پیکر وہی مغلوب الغضب آدمی ہے جو گھر کے باہر ایک چلتی ہوئی تلورا ہے، زندگی کا بھر کا ساتھ ہو تو صبر اور سجھاؤ کی آزمائش کے ہزار مرحلے آتے ہیں، مگر انہوں نے اس معذور بی بی سے کبھی اونچی آواز میں بھی بات نہیں کی۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ ان کی جھلاہٹ اور غیظ و غضب کی ابتدا اسی سانحہ معذوری سے ہوئی، وہ بی بی تو مصلے پر ایسی بیٹھیں کہ دنیا میں جنت مل گئی، قبلہ کو نماز پڑھتے کسی نے نہیں دیکھا، لیکن زندگی بھر جیسی سچی محبت اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر جیسی بے عذر اور خاموش خدمت انہوں نے چالیس برس تک کی، وہی ان کی عبادت و ریاضت، وہ بی بی ان کا ورد و وظیفہ اور وہ بی بی ان کی دعائے یم شبی تھی، وہ بڑا بخشن رہا ہے، شاید یہی انکا وسیلہ

بخشائش بن جائے۔ ایک دور ایسا بھی آیا کہ بیوی سے ان کی یہ حالت نہ دیکھی گئی، خود کہا کسی رانڈ، بیوہ سے شادی کرلو، بولے، ہاں، بھاگوان، کریں گے، کہیں دو گز زمین کا ایک ٹکڑا ہے جو نہ جانے کب سے ہماری بارات کی راہ دیکھ رہا ہے، وہیں چار کاندھوں پہ ڈولا اترے گا، بیوی مٹی سدا سہاگن ہے سا جائیں گے اک روز زمین میں اوڑھ کے ہم بھی بیوی کی آنکھ میں آنسو دیکھتے تو بات کا رخ پھیر دیا کرتے، وہ اپنی ساری، امیجری، لکڑی، حقے اور تمباکو سے کشید کرتے تھے، بولے، بیوی، یہ رانڈ بیوہ کی قید تم نے کیاسوچ کر لگائی؟ مانا شیخ سعدی کہہ گئے ہیں، زن بیوہ مکن اگر چہ حور است، مگر تم نے شاید وہ پوبی مثل نہیں سنی پہلے پیوے بھکوا، پھر پیوے تمکوا، پیچھے پیوے حلیم چاٹ، یعنی جو شخص پہلے حقہ پیتا تھا، وہ بدھو ہے دراصل وہ تو چلم سلگانے اور تاؤ پر لانے میں ہی جٹا رہتا ہے، تمباکو کا اصل مزہ تو دوسرے شخص کے حصے میں آتا ہے اور جو آخر میں پیتا ہے وہ جلے ہوئے تمباکو سے خالی بھک بھک کرتا ہے۔

جدھر جائیں دہکتے جائیں

کراچی میں دکان تو پھر بھی تھوڑی بہت چلی، مگر قبلہ بالکل نہیں چلے، زمانے کے تغیر اور گرد پیش پر کس کا زور چلا ہے، جو ان کا چلتا، حوادث کو روکا نہیں جاسکتا ہے، شخصیت میں پیچ پڑ جائیں تو دوسروں کے علاوہ خود کو بھی تکلیف دیتے ہیں، لیکن جب وہ نکلنے لگیں تو اور زیادہ اذیت ہوتی ہے، کراچی ہجرت کرنے کے بعد اکثر فرماتے کہ ڈیڑھ سال جیل میں رہ کر جو تبدیلی مجھ میں نہ آئی وہ یہاں ایک ہفتے میں آگئی، یہاں تو بزنس کرنا ایسا ہے جیسے چنگھاڑے کے تالاب میں تیرنا، کانپور ہی کے چھٹے ہوئے چھا کٹے یہاں شیر بنے دندنا پھرتے ہیں، اور اچھے اچھے شرفا ہیں، کہ گیدڑ کی طرح دم کٹوا کے بھٹ میں جا بیٹھے، ایسا بجو پڑا خود بخود بل میں ہے ہر شخص سما یا جاتا، جو دانا ہیں وہ اپنی د میں چھپائے بلوں میں گھسے بیٹھے ہیں، باہر نکلنے کی ہمت نہیں پڑتی، اس پر مرزا نے ہمارے کان میں کیا کہا، انیس دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ، ایک دوست نے اپنی آبرو جو کھم میں ڈال کے قبلہ سے کہا کہ گزار ہو زمانہ لوٹ کر نہیں آسکتا، حالات بدل گئے، آپ بھی خود کو بدل لیجئے، مسکرائے، فرمایا، خربوزہ خود کو گول کر لے تب بھی تربوز نہیں بن سکتا۔

بات دراصل یہ تھی کہ زمانے کا رخ پہچاننے کی صلاحیت، حلم و بردباری، نرمی اور لچک نہ ان کی سرشت میں تھی اور نہ زمین دارانہ ماحول اور معاشرے میں ان کا شمار خوبییوں میں ہوتا تھا، سختی، خورائی، تمکنت، خشونت اور جلال مزاج عیب نہیں، بلکہ فیوڈل کردار کی راستی اور مضبوطی کی دلیل تصور کیے جاتے تھے، اور زمین دار تو ایک طرف رہے، اس زمانے کے علما تک ان اوصاف پر فخر کرتے تھے۔ ہم نہ نکہت ہیں، نہ گل

ہیں، جو مہکتے جاویں، آگ کی طرح جدھر جاویں دہکتے جاویں، قبلہ کے حالات تیزی سے بگڑنے لگے تو ان کے بھی خواہ میاں انعام الہی نے جو اپنی خوردی کے باوصف انکے مزاج اور معاملات میں درخور کھتے تھے، عرض کیا دکان ختم کر کے ایک بس خرید لیجئے، گھر بیٹھے آمدنی کا وسیلہ ہے، روٹ پر مٹ میرا ذمہ، آج کل اس دھندے میں بڑی چاندی ہے، یک بارگی جلال آگیا، فرمایا، چاندی تو طبلہ سارنگی بجانے میں بھی ہے، ایک وضع داری کی ریت بزرگوں سے چلی آرہی ہے، جس کا تقاضا ہے کہ خراب و خوار ہی ہونا مقدر میں لکھا ہے تو اپنے آبائی اور آزمودہ طریقے سے ہوں گے، بندہ ایسی چاندی پر لات مارتا ہے چرخ اب ہمیں جو دے ہے، نہیں لیتے ہم، کونین بھی گو دے ہے، نہیں لیتے ہم

ہم لیتے ہیں جس ڈھب سے، نہیں دیتا وہ، جس ڈھب سے کہ وہ دے ہے، نہیں لیتے ہم

آخری گالی

کاروبار مندا بلکہ ٹھنڈا، طبیعت زنگ رنگ، بے دلی کے عالم میں دن گزر رہے تھے، دکان داری اب ان کی مالی نہیں، نفسیاتی ضرورت تھی، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دکان بند کر دی تو گھر میں پڑے کیا کریں گے، پھر ایک دن یہ ہوا کہ ان کا نیا پٹھان ملازم زرین گل خان کئی گھنٹے دیر سے آیا، ہر چند غصے کو پینے کی کوشش کرتے، لیکن پرانی عادت کہیں جاتی ہے، چند ماہ قبل انہوں نے ایک ساٹھ سالہ منشی ادھی تنخواہ پر رکھا تھا، جو گیر وے رنگ کا ڈھیلا ڈھالہ جبہ پہنے، ننگے پیر زمین پر آلتی پالتی مارے حساب کتاب کر رہے ہیں، کرسی یا کسی بھی اونچی چیز پر بیٹنا اس کے مسلک میں منہ تھا، وارثی سلسلے سے کسی بزرگ سے بیت تھا، فرض شناس، ایمان دار، پابندصوم صلوتہ، زود رنج کا کام میں چوپٹ، قبلہ نے طیش میں آکر کہا ایک دن اسے حرام خور کہہ دیا، سفید داڑھی کا لحاظ بھی نا کیا، اس نے رسان سے کہاں، حضور کے ہاں جوشے وافر ملتی ہے وہ ہی تو فقیر کھائے گا، سلام علیکم یہ جا وہ جا دوسرے دن سے منشی جی نے آنا اور قبلہ نے حرام خور کہنا چھوڑ دیا، لیکن حرام خوروں کے علاوہ اور بھی تو دل دکھانے والے بہتر لفظ ہیں، زرین گل خان کو سخت ست کہتے ہیں ان کے منہ سے روانی اور سرگرمی میں وہی گالی نکل گئی جو اچھے دنوں میں ان کا تکیہ کلام ہوا کرتی تھی، گالی کی بھانک گونج درہ آدم خیل کے پہاڑوں تک ٹھنٹھناتی پہنچی جہاں زرین گل بیوہ ماں رہتی تھی وہ چہ سال کا تھا، جب ماں نے بیوگی کی چادر اوڑھی ہے، بارہ سال کا ہوا تو اس نے وعدہ کیا کہ ماں میں اور بڑا ہو جاؤں تو کراچی میں نوکری کر کے تجھے پہلی تنخواہ سے بغیر پیوند کی چادر بھیجوں گا، اسے آج تک کسی نے یہ گالی نہیں دی تھی، جوان خون، غصیلا مزاج، پھٹان کی غیرت اور پختو کا سوال تھا۔ زرین گل نے ان کی ترچھی ٹوپی اتار کر

پھینک دی اور چاقو تان کر کھڑا ہو گیا، کہنے لگا بڈھے میرے سامنے سے ہٹ جا، نہیں تو ابھی تیرا پیٹ پھاڑ کر کلیجا کچا چبا جاؤں گا۔ تیرا پلید مردہ بلی پہ لٹکا دوں گا۔ ایک گاہک نے بڑھ کر چاقو چھینا، بڈھے نے جھک کے زمین سے اپنی مخملی ٹوپی اٹھائی اور جھاڑے بغیر سر پر رکھ لی۔

کون کیسے ٹوٹتا ہے

دس پندرہ منٹ بعد وہ دکان میں تالا ڈال کر گھر چلے آئے اور بیوی سے کہہ دیا، اب ہم دکان نہیں جائیں گے، کبہ دیر بعد محلے کی مسجد سے عشاء کیا اذان کی آواز بلند ہوئی اور وہ دوسرے ہی اللہ اکبر پر وضو کر کے کوئی چالیس سال بعد نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو بیوی دھک کر رہ گئیں کہ خیر تو ہے، اس لیے کہ انہیں دو سورتوں کے علاوہ کچھ یاد نہیں رہتا، وتر بھی یاد ہوئے چھوڑ کر سلام پھیر لیا کہ یہ تک یاد نہیں آ رہا تھا کہ دعائے قنوت کے ابتدائی الفاظ کیا ہیں۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ آدمی اندر سے ٹوٹ بھی سکتا ہے، اور یوں ٹوٹتا ہے اور جب ٹوٹتا ہے تو اپنوں بیگانوں سے حد یہ کہ اپنے سب سے بڑے دشمن سے بھی صلح کر لیتا ہے، یعنی اپنے آپ سے، اسی منزل پر بصیرتوں کا نزول ہوتا ہے، دانش و بینش کے باب کہلتے ہیں۔

چشم ہو تو آنہ خانہ ہے دھر، منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

کون کیسے ٹوٹتا ہے

ایسے بھی محتاط لوگ ہیں جو پیکار و فشار زیست سے بچنے کی خاطر خود کو بے عملی کے حصار عافیت میں قید رکھتے ہیں، یہ بہاری و قمیتی پردوں کی طرح لٹکے لٹکے ہی لیر لیر ہو جاتے ہیں، کچھ گم صم گمبھیر لوگ اس دیوار کی مانند تڑختے ہیں، جس کی مہین سے دراڑ جو عمدہ پینٹ یا کسی آرائشی تصویر سے باآسانی چھپ جاتے ہیں، اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ نیو اندر ہی اند کسی صدمے سے زمین میں دھنس رہی ہے، بعض لوگ چینی کے برتن کی طرح ٹوٹتے ہیں، کہ مسالے آسانی سے جڑ تو جاتے ہیں، مگر وہ بال اور جوڑ پہلے نظر آتا ہے، برتن بعد میں، اس کے برعکس کچھ ڈھیٹ اور چپکو لوگ ایسے اٹوٹ مادے کے بنے ہوتے ہیں کہ چیونگ گم کی طرح کتنا ہی چباؤ توٹنے کا نام نہیں لیتے، کھینچنے سے کھینچنے ہیں، چھوڑے سے جاتے ہیں سکر، آپ انہیں حقارت سے تھوک دیں تو جوتے سے اس بری طرح چپکتے ہیں، کہ چھٹائے سے نہیں چھوتے رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ اس سے تو دانتوں تلے ہی بھلے تھے، کہ پپول تو لیتے ہیں، یہ چیونگ گم لوگ خود آدمی نہیں، پر آدم شناس ہیں، یہ کامیاب و کامران کامگار لوگ ہے، یہ وہ ہیں جنہوں نے انسانوں کو دیکھا، پرکھا اور برتا ہے اور جب اسے کھوٹا پایا تو خود بھی کھوٹے ہو گئے وقت کی اٹھتی موج نے اپنے حباب کا تاج ان کے

سر پہ رکھا اور ساعت گزران نے اپنے تخت روان پہ بٹھایا۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ کار کے ونڈ اسکرین کی مانند ہوتے ہیں، ثابت و سالم ہیں تو سینہ عارف کی طرح شفاف کہ دو عالم کا نظارہ کرلو، اور یکا یک توڑے تو ایسے ٹوڑے کہ نہ بال پڑا، نہ در کے نہ ترخے، یکبارگی ایسے ریزہ ریزہ ہوئے کہ ناعارف رہا، نہ دو عالم کی جلوہ گری، نہ آئینے کا پتا کہ کہاں تھا، کدھر گیا، نہ حذر رہانہ خطر رہا، جو رہی سو بخبری رہی۔ اور ایک انا ہے کہ یوں ٹوٹتی ہے جیسے جابر سلطانوں کا اقبال یا حضرت سلیمان کا عصا جس کی ٹیک لگائے وہ کھڑے تھے، کہ روح قفس عنصری سے پروز کرگئی، لیکن ان کا قالب بے جان ایک مدت تک اسی طرح استادہ رہا اور کسی کو شبہ تک نہ گزرا کہ وہ رحلت فرما چکے ہیں، وہ اسی طرح بے روح کھٹے رہے اور ان کے اقبال اور رعب و دبدبے سے کاروبار سلطنت حسب معمول سابق چلتا رہا، ادھر عصا کو دھیرے دھیرے گھن اندر سے کھاتا رہا، یہاں تک کہ ایک دن وہ چٹاخ سے ٹوٹ گیا اور حضرت سلیمان کا جسد خاکی فرش زمین پر آ رہا، اس وقت ان کی امت اور رعیت پر کھلا کہ وہ دنیا سے پردہ فرما چکے ہیں۔ سو وہ دیمک زدہ عصائے پندار و جلال جس کے بل قبلہ نے غل و غش زندگی گزارے آج شام ٹوٹ گیا اور زیست کرنے کا وہ طنطہ اور ہمہمہ سرنگوں ہوا۔

میں پاپن ایسی جلی کوئلہ بھئی نہ راکہ

انہیں اس رات نیند نہیں آئی، فجر کی اذان ہو رہی تھی کہ کہ ٹمبر مارکیٹ کا ایک چوکیدار ہانپتا کانپتا آیا اور خبر دی کہ صاحب جی، آپ کی دکان اور گودام میں آگ لگ گئی ہے، آگ بھجانے کے انجن تین بجے ہی آگئے تھے، سارا مال کوئلہ ہو گیا، صاحب جی، آگ کوئی آپ ہی آپ تھوڑا ہی لگتی ہے، وہ جس وقت دکان پہنچے تو سرکاری اصطلاح میں آگ پر قابو پایا جا چکا تھا، فائر بریگیڈ کی متعدد اور کارکردگی کے علاوہ اس کو بھی بڑا دخل تھا کہ اب جلنے کے لیئے کچھ باقی نہیں رہا، شعلوں کی لپلیاتی دو شاخہ زبانیں کالی ہو چلیں تھیں، البتہ چیڑ کے تختے ابھی تک دھڑ دھڑ جل رہے تھے، اور فضا دور دور تک ان کی تیز خوشبو کے آتشیں آبخار میں نہائی ہوئی تھی، مال جتنا تھا۔

سب جل کر راکہ ہو چکا تھا۔ صرف کونے میں ان کا چھوٹا سا دفتر بچا تھا، عرصہ ہوا، کانپور میں جب لال رمیش چندر نے ان سے کہا تھا حالات ٹھیک نہیں ہیں، گودام کی انشورنس پالیسی لے لو، تو انہوں نے ململ کے کرتے کی چنی ہوئی آستین الٹ کر اپنے بازو کی پھڑکتی ہوئی مچھلیاں دکھاتے ہوئے کہا تھا، یہ رہی یاروں کی انشورنس پالیسی، پھر اپنے ڈنٹر پہلا کر لالہ رمیش چندر سے کہا، ذرا چھوکر دیکھو، لالہ جی نے اچنبھے سے کہا لوہا ہے لوہا، بولے نہیں فولاد کہو۔ دکان کے سامنے خلقت کے ٹھٹ لگے تھے، ان کو لوگوں نے اس طرح راستہ دیا جیسے جنازے کو دیتے ہیں، ان کا چہرہ جذبات سے عاری تھا، نہ لب بے سوال پر کوئی لرزش، انہوں نے اپنے دفتر کاتالا کھولا، انکم ٹیکس

کے حسابات اور گوشوارے بغل میں مارے اور گودام کے مغربی حصے میں جہاں چیڑ سے ابھی شعلی اور خوشبوؤں کی لپٹیں اٹھ رہی ہیں، تیز تیز قدموں سے گئے پہلے انکم ٹیکس کے کھاتے اور ان کے بعد چابیوں کا گچھا نذر آتش کیا، پھر آہستہ آہستہ، دائیں بائیں نظر اٹھائے بغیر، دوبارہ اپنے دفتر میں داخل ہوئے، حویلی کا فوٹو دیورا سے اتارا رومال سے پونچھ کر بغل میں دبایا اور دکان جلتی چھوڑ آئے۔ بیوی نے پوچھا اب کیا ہوئے گا؟ انہوں نے سر جھکا لیا۔ اکثر خیال آتا ہے، اگر فرشتے انہیں جنت کی طرف لے گئے جہاں موتیا دھوپ ہوگی اور کاسنہ بادل، تو وہ باب بہشت پر کچھ سوچ کر ٹھٹک جائیں گے۔ رضوان جلد اندر داخل ہونے کا اشارہ کرے گا تو سینہ تانے اس کے قریب جا کر کچھ دکھاتے ہوئے کہیں گے۔ یہ چھوڑ کر آئے ہیں۔

دُعاگو

شاہدریاض

shahid.riaz@gmail.com